ಕರ್ನಾಟಕ ರಾಜ್ಯ ಮುಕ್ತ ವಿಶ್ವವಿದ್ಯಾನಿಲಯ
ಮಾನಸಗಂಗೋತ್ರಿ, ಮೈಸೂರು ೫೭೦ ೦೦೬

KARNATAKA STATE OPEN UNIVERSITY
Manasagangothri, Mysore - 570 006

M.A. FINAL - URDU

دکنی زبان وادب

Course - V, Block - 1
Unit 1 - 4

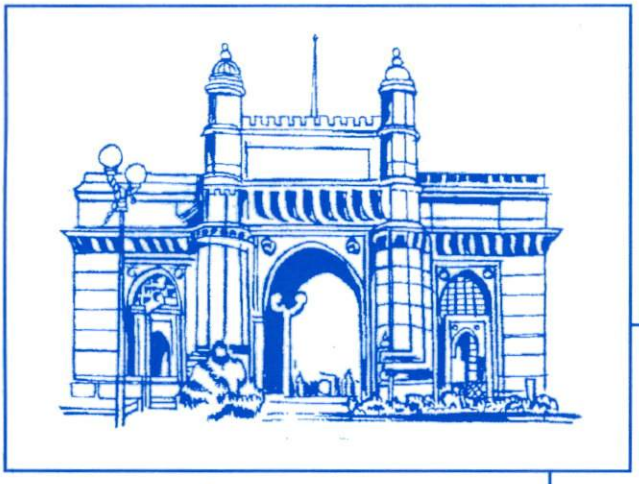

چار مینار

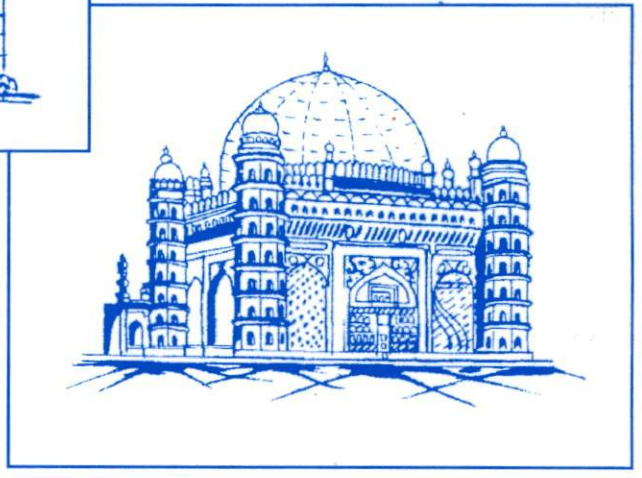

گول گنبد

COURSE - 5 **BLOCK - 1**

KSOU NATIONAL INTERNATIONAL RECOGNITION

Karnataka State Open University (KSOU) was established on 1st June 1996 with the assent of H.E. Governor of Karnataka as a full fledged University in the Academic year 1996 vide Government notification No./EDI/UOV/dated 12th February 1996 (Karnataka State Open University Act – 1992). The Act was promulgated with the object to incorporate an Open University at the State Level for the introduction and promotion of Open University and Distance Education Systems in the education pattern of the State and the Country for the Co-ordination and determination of standard of such systems.

- With the virtue of KSOU Act of 1992, Karnataka State Open University is empowered to establish, maintain or recognize Institutions, Colleges, Regional Centres and Study Centres at such places in Karnataka and also open outside Karnataka at such places as it deems fit.
- All Academic Programmes offered by Karnataka State Open University are recognized by the Distance Education Council (DEC), Ministry of Human Resource Development (MHRD), New Delhi.
- Karnataka State Open University is a regular member of the Association of Indian Universities (AIU), New Delhi, since 1999.
- Karnataka State Open University is a permanent member of Association of Commonwealth Universities (ACU), London, United Kingdom since 1999. Its member code number: ZKASOPENUINI.
- Karnataka State Open University is a permanent member of Asian Association of Open Universities (AAOU), Beijing, CHINA, since 1999.
- Karnataka State Open University has association with Commonwealth of Learning (COL), Vancouver, CANADA, since 2003. COL is an intergovernmental organization created by commonwealth Heads of Government to encourage the development and sharing of open learning distance education knowledge, resources and technologies.

Higher Education To Everyone Everywhere

Karnataka State Open University

Manasagangothri, Mysore - 570 006

کرناٹک اسٹیٹ اوپن یونیورسٹی،

مانسا گنگوتری، میسور

MA (FINAL) URDU

COURSE - 5 - DAKNI LANGUAGE & LITERATURE

BLOCK - 1 (1 - 4) UNITS

ایم اے: سال دوم

کورس-۵ دکنی زبان وادب

حصہ-1-اکائیاں(1-4)

MA (FINAL) URDU

COURSE - 5 - DAKNI LANGUAGE & LITERATURE

BLOCK - 1 (1 - 4) UNITS

ایم اے: سال دوم

کورس-۵ دکنی زبان وادب

حصہ-1-اکائیاں (۱-۴)

وائس چانسلر

پروفیسر کے سدھارائو

ڈین اکاڈمک

پروفیسر چمبی پرانک

فیکلٹی ممبرس

1۔ ڈاکٹر جہاں آراء بیگم

ریڈر وصدر شعبہ اُردو، کے یس او یو، میسور

2۔ بلقیس بانو۔ ایم

سینئیر لیکچرر، اور کوآرڈینیٹر، کے یس او یو، میسور

مصنف

ڈاکٹر یوسف سرمست

وظیفہ یاب پروفیسر، آرٹس کالج،

عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد

ایڈیٹر

ڈاکٹر جہاں آراء بیگم

نصاب کا مقصد

آپ کے نصاب میں کورس نمبر ۵ میں دکنی زبان وادب کا ایک پرچہ شامل ہے جس کے مکمل ۷ بلاک ہوں گے۔ بلاک نمبر ا، دکنی ادب کا ایک جز ہے۔ اس بلاک میں چار اکائیاں شامل ہیں، پہلی اکائی میں دکنی زبان وادب کے مطالعے کی اہمیت اور ضرورت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس اکائی میں دکنی زبان کے متعلق تفصیل موجود ہے۔ دوسری اکائی میں اردوئے قدیم یا دکنی کی لسانی خصوصیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جس میں دکنی کا تقابلی مطالعہ دہلی کی نواحی بولیوں سے لیا گیا ہے۔ تیسری اکائی میں بہمنی عہد کی لسانی اور ادبی خدمات کے تحت مختلف شعرا اور ادباء کی تخلیقات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ چوتھی اکائی دکنی شعر وادب کا آخری دور، عہد ولی اور سراج کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔

ان ابوب میں طلباء کی سہولت کے لئے ہر اکائی کے آخر میں نمونہ امتحانی سوالاب بھی دیئے گئے ہیں اور فرہنگ کے تحت مشکل معنوں کے الفاظ بھی درج ہیں۔ سفارشی کتب کے نام بھی آخر میں دیئے گئے۔ ان اکائیوں کا بہ غور مطالعہ کریں مجھے امید ہے کہ آپ ضرور اس سے مستفید ہوں گے۔

مشمولات

اکائی ۱: دکنی زبان وادب کے مطالعے کی اہمیت وضرورت
اکائی ۲: اردوئے قدیم یا دکنی کی لسانی خصوصیات
اکائی ۳: بہمنی عہد کی لسانی اور ادبی خدمات
اکائی ۴: دکنی شعروادب کا آ کری دور۔ عہد ولی اور سراج

اکائی ۱: دکنی زبان وادب کے مطالعے کی اہمیت وضرورت

ساخت:

1.0 اغراض ومقاصد

1.1 تمہید

1.2 دکنی زبان وادب کے مطالعے کی اہمیت وضرورت

1.3 نمونہء امتحانی سوالات

1.4 خلاصہ

1.5 فرہنگ

1.6 سفارش کردہ کتابیں

1.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

☆ دکنی زبان وادب کے مطالعے کی ضرورت کو سمجھ سکیں۔

☆ دکنی الفاظ کے معنی جان سکیں

☆ دکنی الفاظ کا تلفظ جان سکیں۔

1.1 تمہید:

یہ بلاک کورس ۵ کا پہلا حصہ ہے جس میں دکنی زبان وادب کے مطالعے کی اہمیت اور ضرورت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جنوبی ہند میں یہ زبان پروان چڑھی۔ اس زبان کو آگے بڑھانے میں نہ صرف

صوفیائے کرام نے مدد کی بلکہ اس دور کے سلاطین اور عوام نے بھی آگے بڑھانے میں پیش پیش رہے۔اس زبان وادب کا قابل قدر سرمایہ آج بھی محفوظ ہے۔جو ہمیں اس دور کی معاشرتی زندگی اور اس دور کی تہذیب کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔جو الفاظ اس دور میں استعمال کئے جاتے تھے، وہ اب متروک ہیں۔معیاری اردو اور دکنی اردو دونوں کا فرق بھی اس اکائی کے مطالعے کے بعد واضح ہو جائیگا۔بعض ایسے الفاظ بھی ہیں جو آج بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔اس اکائی کے آخر میں نمونہ امتحانی سوالات فرہنگ اور سفارشی کتب کے نام بھی دیئے گئے ہیں مجھے امید ہے کہ آپ ضرور ان سے مستفید ہوں گے

1.2 دکنی زبان وادب کے مطالعے کی اہمیت وضرورت:

دکنی زبان وادب کے مطالعے کی اہمیت اور ضرورت پر غور کرنے سے پہلے اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ خود زبان وادب کے مطالعے کی کیا اہمیت ہے اور کیوں ضرورت ہے۔زبان اظہار وابلاغ کا ذریعہ ہے۔اس کے بغیر ان کا زندہ رہنا محال ہو جاتا ہے۔سماج میں زندگی گزارتے ہیں۔لیکن وہ بھی زبان استعمال کرتے ہیں ان کی زبان، اشاروں کی زبان ہوتی ہے، بعض جدید علماء اور مفکرین تو یہاں تک کہتے ہیں کہ زبان ہی کے ذریعے ہم دنیا کی ہر چیز کو جانتے اور پہچانتے ہیں، وہ زندگی میں زبان کو ثانوی حیثیت نہیں دیتے، بلکہ اس کو محوری اور مرکزی مقام دیتے ہیں۔ان کے نزدیک زبان ہی کے ذریعے ہم مختلف خیالات اور تصورات میں فرق اور امتیاز کرتے ہیں۔ زبان ہی خیالات اور تصورات کو ایک شکل دیتی ہے، زبان کے بغیر خیالات اور تصورات بے شکل، بے چہرہ اور گڈمڈ ہوتے ہیں۔زبان ہی کے ذریعے وہ ایک دوسرے سے الگ اور ممتاز ہوتے ہیں۔اسی وجہ سے ایک مغربی مفکر لاکان نے یہ بات کہی ہے کہ "دنیائے الفاظ ہی دنیا سے اشیاء کی تخلیق کرتی ہے"

It is the world of words that creates the world of things.

دنیا کی جو چیزیں ہیں ان کو ہم زبان کے الفاظ ہی کے ذریعے پہچانتے ہیں، پھول، پھل، نیر، پلنگ، الماری غرض کہ دنیا کی کوئی چیز ہو جب تک ہم اس کے لئے کوئی لفظ استعمال نہ کریں وہ ہمارے لئے موجود نہیں ہوتی۔ کیونکہ بغیر لفظ یا نام کے اس کا ہونا یا نہ ہونا ہمارے لئے برابر ہوتا ہے، لیکن جوں ہی ہم اس کا نام یا اس کے لئے کوئی لفظ استعمال کرتے ہیں اس کا پورا پیکر ہمارے ذہن میں ابھر جاتا ہے۔ گویا الفاظ اس کی تخلیق کرتے ہیں۔ کرسی کا لفظ گویا ذہن میں کرسی کو پیدا کر دیتا ہے، اور الماری کہنے سے الماری ہمارے ذہن میں وجود حاصل کر لیتی ہے۔ اسی طرح انسانی زندگی میں زبان کی بے حد اہمیت ہے، اور بے انتہا ضرورت ہے۔ ہم زبان ہی کے ذریعے ہر بات کو جاننے، سمجھنے اور بیان کر سکتے ہیں۔ دنیا کی کوئی بھی بات ہو کوئی بھی علم ہو، کوئی بھی فن ہو اس کو ہم زبان ہی کے ذریعے سیکھتے اور جانتے ہیں۔ جب تک ہم کو زبان نہ آتی ہو اس وقت تک ہم کوئی بھی چیز نہیں سیکھ سکتے ہیں، نہ سکھا سکتے ہیں۔ زبان ہی کے ذریعے ہم ہر علم و فن سیکھ سکتے ہیں۔ اور جب تک اس علم و فن کی زبان پر عبور حاصل نہیں کر لیتے، اس علم و فن کو ہم نہیں سیکھ سکتے۔ ہر علم و فن کی اپنی ایک مخصوص زبان ہوتی ہے۔ اگر ہم کیمیا (کیمسٹری) کا علم حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں کیمیا کے الفاظ تراکیب اور اصطلاحات کو جاننا لازمی ہوگا۔ ہم جب تک کیمیا کی زبان کو نہیں سیکھتے اس وقت تک اس علم کو حاصل نہیں کر سکتے۔ نہ اس علم کو اوروں تک پہنچا سکتے ہیں۔ اسی طرح طب کا علم ہو یا قانون کا جب تک ہم ان علوم کی زبان کو نہیں سیکھتے اس وقت تک ان علوم پر عبور حاصل نہیں کر سکتے۔ اسی طرح ادب کی زبان بھی اپنی الگ خصوصیات رکھتی ہے۔ اور اسی سے پہچانی جاتی ہے۔ یہ بات بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ زبان بھی زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ میر کے زمانے کی زبان کو اگر ہم دیکھیں تو اس میں اور موجودہ زبان میں بہت فرق نظر آئیگا۔ زبان کا یہ فرق دکنی ادب کی زبان اور موجودہ ادب کی زبان میں بے حد نمایاں ہے۔ یہاں تک کہ دکنی زبان اور موجودہ اردو کو بعض لوگ ایک دوسرے سے الگ اور مختلف سمجھتے ہیں۔ بہر حال زبان کا مطالعہ بے حد و بے انتہا اہمیت رکھتا ہے۔ دوسرے تمام

جانداروں سے انسان اس لئے الگ اور مختلف ہے کہ وہ بول سکتا ہے۔ وہ اشرف المخلوقات اسی وجہ سے کہ اس کے سوا کوئی بھی حیوان ناطق نہیں ہے۔

زبان کی اہمیت اور ضرورت کو جان لینے کے بعد اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ادب کے مطالعے کی اہمیت وضرورت کیوں ہے اور کیا ہے؟ اس بات کو سمجھنے کے لئے اگر ہم اس بات پر غور کریں کہ دنیا بھر میں جہاں بھی تعلیم دی جاتی ہے خواہ وہ مکتب ہوں یا مدرسہ یا کالج، ہاں ایک خاص درجے تک ادب لازمی طور پر پڑھایا جاتا ہے۔ جیسے ہمارے ہاں کم ازکم میٹرک یا انٹرمیڈیت تک اور بعض صورتوں میں بی اے تک لازمی طور پر ادب کی تعلیم دی جاتی ے۔ آپ خواہ سائنس کے طالب ہوں یا کامرس یا آرٹس کے آپ کو ایک ادبی کتاب لازمی طور پر پڑھنی پڑتی ہے، جس میں کچھ حصہ شاعری کا ہوتا ہے اور کچھ ادبی نثر کا۔ اس کے لئے ایک سرسری مطالعے کی بھی کتاب ہوتی ہے جو عام طور پر ثانوی ادب سے تعلق رکھتی یا ادبی نوعیت رکھتی ہے۔ ایک ایسے طالب علم کے لئے جو بعد میں ڈاکٹر بننے والا ہے، انجنیر بننے والا ہو یا کوئی عہدے دار بننے والا ہو اس کو ادب کیوں لازمی طور پر پڑھایا جاتا ہے۔ یہ غور طلب بات ہے۔ اصل میں کسی بھی زبان پر عبور پانے کے لئے ادب کا مطالعہ ضروری ہے۔ ادب میں کسی بھی بات کے اظہار کے مختلف طریقے ملتے ہیں۔ زبان وبیان پر قابو پانے کے لئے ادب کا مطالعہ ناگریز ہے۔ ادب میں ایک ہی بات کو بیان کرنے کے پچاسوں انداز اور طریقے ملتے ہیں، شاعری میں علم بیان میں ہی بات بتائی جاتی ہے، اور الفاظ کو برتنے کا ہنر شعروادب ہی کے ذریعے آتا ہے۔ اپنی بات کو پر اثر انداز میں کہنا کا سلیقہ شعروادب کے مطالعہ ہی کے ذریعہ آتا ہے۔

ادب اور شاعری سے ہماری جمالیاتی تسکین اور تشفی ہوتی ہے، خوبصورتی خواہ کسی چیز میں ہو وہ لطف اور انبساط کا سامان مہیا کرتی ہے۔ ہم زندگی میں جو چیزیں خوب صورت ہوتی ہیں انہیں پسند کرتے ہیں۔ یہ ایک اندرونی ضرورت ہوتی ہے، جو جس کو ہر آدمی کسی نہ کسی طرح پورا کرتا ہے۔ ایسا شخص جو ہر چیز کو مادی فائدہ کے نقطہء نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ بھی جمالیاتی احساس یعنی حسن اور

خوبصورتی کا احساس رکھتا ہے۔ایک ایسا تاجر جو ہر چیز کو نفع ونقصان کے ترازو میں تولتا ہے۔وہ بھی کسی نہ کسی طرح سے اپنے جمالیاتی تشفی کا سامان کرتا ہے۔مثال کے طور پر وہ ایک موٹر کار خریدنے جاتا ہے،اس کے سامنے ایک ہی سال کی بنی ہوئی ایک ہی ماڈل کی دو کاریں ہوں لیکن ان میں سے ایک پر پالش ہو دوسری پر پالش نہ ہوت وہ پالش والی کار ہی لے گا حالانکہ جہاں تک کارکردگی کا سوال ہے دونوں بالکل ایک ہیں دوسری تمام چیزیں دونوں میں بالکل ایک ہیں۔وہ باہم میں سے کوئی بھی اس کار کو ترجیح دے گا جو پالیش کی وجہ سے زیادہ خوبصورت نظر آرہی ہے۔یوں ہر انسان کپڑوں سے لے کر کھانے پینے تک جہاں تک ممکن ہو سکے اپنی چیزوں کو لینے کی کوشش کرے گا،تو زیادہ خوبصورت نظر آتی ہیں۔اسی طرح ہر چیز میں ہم اپنے احساس جمال کی تشفی اور تسکین چاہتے ہیں۔ انسان کو اللہ کی طرف سے پانچ حواس ملے ہیں۔ہم اپنے تمام حواس میں ان ہی چیزوں کی طرف مائل ہوتے ہیں ،خوبصورت ہیں یا خوش گوار ہیں،شاعری سے بھی ہر انسان محظوظ ہوتا ہے۔اسی کی پہلی وجہ تو یہی ہے کہ اس میں جو ایک لے ہوتی ہے جو نغمگی ہوتی ہے وہ ہم کو لذت بخشتی ہے،ہم بعض اشعار کو سمجھے بغیر بھ اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں کیونکہ الفاظ کی جو ترتیب اور تنظیم ہوتی ہے،وہ ایک ایسی خوش گوار آواز پیدا کرتی ہے،جو ہم کو مزہ دیتی ہے۔اسی وجہ سے شاعری کے بارے میں یہ کہا گیا ہے؛

A poem should not mean but be

یعنی شاعری یا نظم بامعنی نہ ہو مگر ہو۔مطلب یہ کہ اس کے معنی ہم سمجھیں یا نہ سمجھیں لیکن اس کا وجود ہم کو متاثر کرے۔گویا شعری آہنگ یا لے یا صوتی حسن اپنے موجود ہونے کا احساس دلائے۔ شاعری سے لطف حاصل کرنا انسان کی سرشت میں داخل ہے۔بالکل ان پڑھ آدمی بھی شعر گنگناتا ہے ،اور ایک عالم فاضل بھی۔ایک جاہل آدمی،معمولی درجہ کی شاعری سے لطف حاصل کرے گا اور ایک عالم اعلیٰ درجے کی شاعری کو پسند کرے گا،شاعری اور ادب کی اثر انگیزی سے بڑے بڑے کام لئے جاسکتے ہیں،اور لئے گئے ہیں۔

مولانا الطاف حسین حالؔی نے اپنی مشہور کتاب "مقدمہ شعروشاعری" میں یہ بات کہی ہے کہ "پولیٹکل حالات میں شعر سے بڑے بڑے کام لئے گئے ہیں اس سلسلہ میں انہوں نے لکھا ہے کہ ایتھنز اور سیلمس والوں میں جنگ ہوتی رہتی تھی، اور ہمیشہ ایتھنز والوں ہی کو شکست ہوتی تھی۔ اس طرح مسلسل شکست کھانے سے ایتھنز والوں نے یہی بہتر سمجھا کہ جنگ کرنے سے ہی توبہ کرلیں۔ اس بات پر وہ اس سختی سے عمل کرنے لگے کہ انہوں اعلان کردیا کہ جو کوئی دوبارہ جنگ کی بات کرے گا یا لڑنے کی تحریک پیدا کرے گا اسے قتل کردیا جائیگا، مشہور شاعر اور مدبر سولن نے اپنے ہم وطنوں کی پست ہمتی پر بڑا افسوس ہوا اور اس نے طئے کرلیا کہ خواہ کچھ ہوں وہ اپنے وطنوں کو دوبارہ جنگ کرنے پر آمادہ کرے گا۔ ایسا کرنے کے لئے وہ دانستہ طور پر مجنوں اور پاگل بن گیا۔ جب ایتھز میں یہ بات مشہور ہوئی کہ سولن دیوانہ ہوگیا ہے تو اس نے دیوانوں کا حلیہ بنا کر ایک بلند مقام پر کھڑا ہوگیا، اور نہایت دردانگیز اشعار سنائے جس میں اپنی قوم والوں کو غیرت دلائی اور سیلسم والوں سے انتقام لینے پر سب کو اکسایا۔ ان اشعار کا ایتھنز والوں پر اتنا اور ایسا اثر ہوا کہ سب نے ہتھیار سنبھال لئے اور سلن ہی کو سپہ سالار بنا کر سیلمس پر حملہ کردیا، اور فتح حاصل کی۔ اسی طرح انگلستان کے شاعر لارڈ بائرن کی نظم "چائلڈ ہیرٹوز پلگرمیج" نے بھی یونان کو ترکی کے قبضہ سے آزاد کرانے میں وہی کام کیا جیسے کہ سولن کی شاعری نے کیا تھا، بائرن نے فرانس، انگلستان، اور روس کے لوگوں کو غیرت دلائی کے انہوں نے یونان کو ترکی کی غلامی سے آزاد کرنے میں کوئی کوشش نہیں کی اور بے غیرتی سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں، مولانا حالی لکھتے ہیں:

"۱۸۱۴ء میں اس نظم کی اشاعت ہوئی جس کے سبب بائرن کی شاعری کی تمام یورپ میں دھوم ہوگئی اور انگریز اس کی نظم پر مفتوں ہوگئے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ فرانس، انگلستان، اور اٹلی، آسٹریا، اور روس میں اس نظم نے وہ کام کیا جو آگ بارود پر کرتی ہے، جس وقت یونان نے ترکی سے بغاوت اختیار کی۔ یورپ کا متفقہ بیڑا فوراً اس کی کیمپ کو پہنچا، ۱۸۲۷ء میں شفقہ بیڑے نے ترکوں کے بیڑے کو

شکست دی اور ترکی کو یونان کو آزاد کرنے پر مجبور کیا گیا"

یہ تو سیاسی معاملات میں شعر وسخن کی اثر انگیزی تھی۔ مولانا حالی نے سماجی زندگی میں بھی شاعری کے اثر سے جو مسائل حل ہو جاتے ہیں ان کی بھی مثال دی ہے۔ عرب کا ایک مشہور شاعر میمون بن قیس تھا چونکہ وہ اندھا تھا اس وجہ سے اسے اعشیٰ کہتے تھے، وہ اپنے کلام میں اتنی تاثیر رکھتا تا کہ جس کسی کی تعریف کرتا وہ شخص نیک اور اچھا سمجھا جاتا تھا۔ جس کسی کی ہجو کرتا وہ برا اور ذلیل سمجھا جاتا۔ اعشیٰ کے پاس ایک عورت آئی اس نے کہا کہ میری کئی لڑکیاں ہیں، لیکن ان کی شادی نہیں ہو رہی ہے۔ تم اگر چاہو تو اپنی شاعری سے سب کو ان کی طرف متوجہ کر سکتے ہو۔ اعشیٰ نے ان لڑکیوں کی صورت اور سیرت کی تعریف میں اشعار کہے۔ جس کی وجہ سے ان کے حسن و جمال اور اخلاق و عادات کی اتنی شہرت ہوئی کہ چاروں طرف سے ان کے پیام آنے لگے، اور بڑے بڑے گھرانوں میں ان لڑکیوں کی شادیاں ہو گئیں۔ جس طرح شاعری کا اثر ہوتا ہے اسی طرح نثر بھی لوگوں کو متاثر کرتی ہے، خاص طور پر خطابت، خود حیدر آباد میں ایک واقعہ مشہور ہے، بہادر یار جنگ بڑی فصیح اور بلیغ تقریر کیا کرتے تھے۔ جنہوں نے ان کی تقریر سنی ہے ان کا کہنا ہے کہ آج تک ان کے جیسا خطیب کم از کم حیدر آباد میں پیدا نہیں ہوا۔ بہر حال ان کے بھانجوں کو ایک فرقے کے لوگوں نے قتل کر دیا تھا۔ اس موقع پر ایک زبردست مجمع جمع ہو گیا اور انتہائی غیض وغضب میں اس فرقے کے لوگوں سے انتقام لینے کے لئے بڑھنے لگا۔ لوگوں نے اس بات کی خبر بہادر یار جنگ کو دی اور بتایا کہ کہ سارے شہر میں فساد پھوٹ پڑے گا، اور بے حد خون خرابہ ہوگا، یہ سنتے ہی بہادر یار جنگ اس مقام پر پہنچے جہاں صدہا لوگ جمع تھے اور بے حد مشتعل تھے۔ وہ وہاں پہنچ کر اپنی کار کی چھت پر کھڑے ہو گئے اور اپنے زور خطابت سے لوگوں کو اس درجہ متاثر کر دیا کہ نہ صرف پر سکون ہو گئے بلکہ خاموشی سے اپنے گھروں کی راہ لی۔ یوں شعر وادب سے بڑے بڑے کام لئے جاسکتے ہیں۔

انسان علم وفن کے کسی بھی میدان میں چلا جائے جب تک اسی میں قوت اظہار پیدا نہیں ہوگی

اس کی صلاحتیں سامنے نہیں آتیں جب کسی انسان میں قوت اظہار پیدا ہو جاتی ہے تو وہ اپنے علم وفن کو دوسرے تک پہنچا سکتا ہے اور دوسرے اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اسی وجہ سے تعلیمی نصاب میں ایک خاص مدت اور درجے تک شعر وادب کے مطالعے کی اہمیت اور ضرورت ہوتی ہے۔

زبان اور ادب کی زندگی میں جو اہمیت اور ضرورت ہے اس کو جان لینے کے بعد ہم اس بات پر غور کر سکتے ہیں کہ دکنی زبان وادب کے مطالعے کی کیا اور کیوں اہمیت اور ضرورت ہے۔ سب سے پہلے تو اس کی اہمیت اور ضرورت اس لئے ہے کہ یہ ہماری ادبی تاریخ کا حصہ ہے۔ اپنی تاریخ سے ناواقف رہنا اپنے ماضی سے ناواقف رہنا ہے۔ ماضی ہی کی وجہ سے ہم حال تک پہنچتے ہیں، اور مستقبل کا تعین کرتے ہیں۔ اگر ہم گھر سے باہر نکلنے کے بعد اپنے ماضی کو بھول جائیں تو پھر گھر کا راستہ نہیں مل سکتا۔ ماضی کی بنیادوں پر حال اور مستقبل تعمیر ہوتا ہے۔ اس لئے تاریخ سے غفلت ماضی سے غفلت ہے۔ اور ماضی سے غافل ہونا اپنے حال اور مستقبل کو برباد کرنا ہے، اس لئے خواہ ملک کی تاریخ ہو یا زبان کی، ہم تاریخ سے غافل یا ناواقف نہیں رہ سکتے۔ اس لئے ان کا مطالعہ لازمی اور ضروری ہے۔

زبان وادب کا مسلسل ارتقاء ہوتا رہتا ہے۔ اسی وجہ سے دکنی ادب کی زبان ہمارے لئے نامانوس بن گئی ہے۔ وہ لوگ جو جنوبی ہند میں رہتے ہیں ان کے لئے دکنی زبان وادب اتنے نامانوس نہیں ہوتے جتنے شمالی ہند والوں کے لئے ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ جنوبی ہند میں بول چال کی زبان بڑی حد تک دکنی ہی ہے۔ دکنی زبان وادب کے مطالعے سے ہم اپنے پچھلے ادبی سرمایے سے واقف ہو سکتے ہیں۔ اس واقفیت سے اردو زبان وادب پر جو بعض اعتراضات ہوتے ہس ان کا جواب دیا جا سکتا ہے۔

اردو زبان وادب پر ایک اعتراض یہ ہوتا ہے کہ اس میں ہندوستانی ماحول اور ہندوستان کی چیزوں کو پیش نہین کیا جاتا۔ اس کے الفاظ، تشبہیں، استعارے اور تلمیحات سب کی سب فارسی اور عربی ہوتی ہیں۔ دکنی اب کے مطالعے سے اور معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کے اثرات بعد میں پیدا

ہوئے ، دکنی زبان وادب کا سرمایہ ہندوستان ماحول اوراس کے الفاظ زیادہ تر ہندوستانی ہیں، یہاں دلی کی ایک غزل پیش کی جارہی ہے جس کے ہر شعر میں ہندوستانی ماحول اور الفاظ ملتے ہیں:

تجھ چال کی قیمت سوں نہیں دل ہے مرا واقف — اے ناز بھری چنچل ٹک بھائے تہائی جا

اس رین اندھیری میں مت بھول پڑوں تس سوں — تک پاؤں کے بچھووں کی آواز سناتی جا

مجھ دل کو کبوتر کوں پکڑا اسے تری لٹ نے — یہ کام دھرم کا ہے ٹک اس کو چھڑاتی جا

تجھ مکھ کی پرستش میں گئی عمر مری ساری — اے بت کی بچن ہاری اس بت کو بجاتی جا

تجھ عشق میجل جل کر سب تین کو کیا کاجل — یہ روشنی اخذا ہے انکھیاں کو لگاتی جا

تجھ عشق میں دل جل جل کر جوگی کی لیا صورت — یکبار ارے موہن چاتی سوں لگاتی جا

تجھ گھر کی طرف سندر آتا ہے دلی دائم — مشتاق ہے درسن کا ٹک درسن دکھاتی جا

دکنی زبان دوسری ہندوستانی زبانوں سے زیادہ قریب تھی، جیسے دکنی میں جمع بنانے کا بہت آسان طریقہ ہے "اں" لگا کر جمع بنالی جاتی ہے جیسے عورتاں، کتاباں، گھراں، مکاناں، وغیرہ یہ طریقہ اتنا اچھا تھا کہ ہم انگریزی الفاظ کی جمع بھی بہت اچھی طرح بنا لیتے تھے۔ جیسے ٹیلی وژن یہ لفظ تو ہم نے لے لیا ہے لیکن اس کا جمع بنانے کا موجودہ اردو میں کوئی طریقہ نہیں ہے، لیکن دکنی میں کسی بھی زبان کا لفظ ہو اس جمع "اں" لگا کر بنائی جاسکتی ہے۔ جیسے ٹیلی وژناں، بل Bill کی جمع بلاں، گلاس کی جمع گلاساں، کلاس کی کلاساں، اصل میں جمع بنانے کا یہ طریقہ فارسی کا ہے، جیسے رفتگاں، یاراں، وغیرہ۔ دکنی میں سنسکرت الفاظ بھی استعمال ہوا کرتے تھے، چتر، لوپ، اتم، سنسار وغیرہ۔ مرہٹی کے الفاظ بھی دکنی میں ملتے ہیں؛ ہے کے لئے "ہے" اتم، نکو، ہاؤ، سپسرڑنا، لتمبر (لٹم بر) "ہی" کے لئے چ یہی کے لئے یچ ، وہی کے وہیچ وغیرہ ہے، کے لے اہے" کا لفظ سندھی اور سرائکی میں بھی ملتا ہے۔ گمت (تماشا) کا موا (تالاز) چاڑ (مٹھاس) اسی طرح ہندوستان کی کئی دوسری زبانون کے الفاظ دکنی میں

ملتے ہیں۔ دکنی میں جو خالص ہندوستانی الفاظ تھے ان کو بعد میں مصلحین زبان جیسے مظہر جان جاناں، حاتم اور اس کے بعد ناسخ نے ترک کر دیا۔ اس طرح سے بے شمار الفاظ جو دکنی اور ہندوستانی زبانوں کے تھے، "ترکاوت" کہلانے لگے، مسعود حسین خان نے ان کی فہرست اپنی کتاب "مقدمہ تاریخ زبان "اردو" میں دی ہے۔ یہاں چند مثالیں پیش کئے جا رہے ہیں

نین (آنکھ)، ساجن (محبوب)، جگ (دنیا)، دشن (زیارت)، ماس (گوشت)، موہن (کوبب)، پیا (محبوب)، براد (فراق)، من (دل)، سنسار (دنیا)، باٹ (راستہ)، دارو (دوا)، پیتم (محبوب)، سریجن (محبوب) سُرج (سورج)، جیو (جی)، نمن (طرح) چند (چاند)، بنا (بن)، باج (بغیر)، نیں (نہیں)، اتا (اتنا)، بوجھنا (سمجھنا)، آپس (اپنے) (مقدمہ تاریخ زبان، ۲۰۶)

دکنی اور ہریانی میں بہت سی باتیں مشترک ملتی ہیں۔ شمالی ہند کے قدیم اردو مصنفین جن کا تعلق ہریانہ سے تھا ان میں اور دکنی میں ایک جیسا انداز اور ایک جیسی اردو ملتی ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان لکھتے ہیں؛

> "ہریانہ کے قدیم ترین مصنفین محمد افضل اور عہدہ، شیخ محبوب عالم ساکن جھجر وغیرہ کے یہاں ملتی ہیں مثلاً دن کی جمع دناں، کھیت کی جمع کھیتاں، گھر کی جمع گھراں وغیرہ، آج بھی ہریانہ کے علاقے میں بولی جاتی ہیں۔ شیخ محبوب عالم کے "محشر نامہ" میں اسی نہج پر ٹکراں، غسہ بیاں، جھوٹاں، اونٹاں، وغیرہ ملتی ہیں۔"

دکنی دوسری ہندوستانی زبانوں سے جتنی قریب تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ پنجابی میں جس طرح الفاظ بولے جاتے تھے، اسی طرح دکنی میں بھی بولے جاتے تھے، پنجابی میں حروف علت کھینچ کر نہیں پڑھے جاتے جیسے،

مونگ: منگ، بادل: بدل، لاکھ: لکھ، چاول: چول،

دکنی میں بھی الفاظ کا یہی تلفظ ملتا ہے۔ مسعود حسین خان لکھتے ہیں

"دکنی میں عام طور سے الفاظ کا تلفظ بہ حقیقت حرف، علت ہوتا ہے، مثلاً سجّن (ساجن)، سرج (سورج)، ٹٹنا (ٹوٹنا)، بُند (بوند)، کُئی (کوئی)، بدّل (بادل)، ہتّی (ہاتھی)، اُپر (اوپر) دُسرا (دوسرا)، تسرا (تیسرا)، گدا (گودا)، گھُنگٹ (گھونگھٹ)، پرم (پریم)، پرت (پریت)، اسمان (آسمان) غصب (غائب) منگنا (مانگنا)، دھنڈنا (ڈھونڈنا)، (مقدمہ تاریخ زبان اردو، ۴۴ تا ۲۴۲)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی یہی لکھا ہے کہ ہندوستان کی مختلف زبانوں اور بولیوں کے الفاظ دکنی میں شامل تھے۔ سنسکرت سے لے کر جدید ہندوستان تک بے شمار الفاظ دکنی زبان و ادب کا جزو تھے۔ جمیل جالبی د لکھتے ہیں؛

"زبان و بیان میں مختلف بولیوں کے الفاظ ملے جلے ہیں سنسکرت کے الفاظ کثرت سے استعمال میں آئے ہیں۔۔۔۔ان میں سے اکثر الفاظ پت (دل)، ناری (عورت)، چھند (بات، فریب)، ویٹھنا (دیکھنا) ویل (وقت) ہوں (میں)، سجات (اعلیٰ ذات کا نام)، کجات (کم زات) اسنگت (برکا صحبت)، دونپ چھانپ (سستی، اٹھکھیاں)، راؤ (راجہ)، کرتار (خدا)، انیائے (ناانصافی)، کھڑگ (تلوار)، ٹھار (جگہ)، نھاس (بھاگنا)، پران (جان)، پونچ (دم)، تبال (راکشش)، پیتاؤ (بھروسہ)، کندن (سونا)، پھاندا (پھندا، نانو (نام)، دوس (قصور)، پت ورت (شور کی وفادار)، وغیرہ آج بھی برصغیر کی مختلف زبانوں میں استعمال ہوتے ہیں، یہی وہ پہلی روایت ہے جسے ہم نے ہندوی روایت کا نام دیا ہے، جو پر صدیوں تک اردو زبان چلتی رہی" (تاریخ زبان اردو جلد اول، ۱۴۶)۔

دکنی زبان اور ادب سے ناواقفیت کی بنا پر اردو شاعری پر اعتراض کئے گئے ہیں اگر مورخین دکنی شعر و ادب سے واقف ہوتے تو کبھی ایسے اعتراضات نہ کرتے۔ کلیم الدین احمد نے اپنی مشہور

کتاب "اردو شاعری پر ایک نظر" لکھی ہے۔ وہ اگر دکنی زبان وادب سے واقف ہوتے تو یہ کتاب بھی شاید نہیں لکھتے۔ کیونکہ انہوں نے جگہ جگہ یہ بات لکھی ہے کہ اردو شاعری فارسی کی حلقہ بہ گوش ہے کتاب کہ ابتداء ہی میں وہ لکھتے ہیں؛

"اردو شاعری نے فارسی کے سایہ میں پرورش پائی۔ اس ابتدائی اثر کا نتیجہ تاصف خیز نہ ہوتا اگر اردو شاعری اپنی ترقی کے اول مدارج طے کرنے کے بعد اس اثر سے آزاد ہو کر اپنی دنیا الگ ایجاد کرتی" (اردو شاعری پر ایک نظر ۲)

یہ باتیں انہوں نے کتاب کے "حصہ اول" میں کہی ہیں جس کا ذیلی عنوان ہے "قدیم اردو اگر وہ دکنی شاعری کے تین سو سالہ دور سے واقف ہوتے تو میر و غالب کے عہد کو "قدیم اردو" نہ لکھتے اور سب سے بری بات یہ کہ وہ یہ نہیں لکھتے کہ اردو شاعری نے فارسی کے اثر سے آزاد ہو کر اپنی الگ دنیا نہیں بنائی ہے۔ دکنی شاعری فارسی سے اس درجہ آزاد تھی جس کا اندازہ کسی بھی ایسے شخص کو نہیں ہوسکتا جس نے اس کا سرسری مطالعہ تک نہ کیا ہو۔ وہ اگر دکنی شاعری کی کتابوں کے صرف ناموں سے بھی واقف ہوتے تو ایسا نہ لکھتے۔ کیونکہ دکنی مثنویوں کے نام ہی یہ بتاتے ہیں کہ دکنی شاعری فارسی کے اثر سے آزاد تھی۔ دکنی مثنویوں کے نام ہیں، پرت نامہ، پھول بن، چندر بدن ومہیار، چند چھنداں، دیپک پتنگ، سکھ انجن، مینا ستونتی، ناری نامہ۔

دکنی کے نام اگر فارسی کے زیر اثر ہوں تو بھی ان کی فضا اور کردار اور ماحول سرتاسر ہندوستانی ہیں جیسے نصرتی کی مثنوی، "گلشن عشق" کے مرکزی کردار منوہر اور مدمالتی ہیں، اس کے علاوہ مثنوی میں جو تہذیب ومعاشرت کی عکاسی کی گئی ہے وہ بھی تمام دکھنی ہے۔ یہاں کے رسم ورواج کی عکاسی مثنوی میں ہر جگہ ملتی ہے۔ مثنوی میں جس ترتیب اور تنظیم کو کام میں لایا گیا ہے، اس کے تعلق سے جمیل جالبی لکھتے ہیں؛

"پوری مثنوی میں ایک سرا دوسرے سرے سے مربوط ہے، اور مثنوی کے ارتقاء میں ایک اہتمام

اورفن کوشعوری طور پر برتنے کا احساس ہوتا ہے،اس مثنوی کا اگر کلیم الدین احمد نے مطالعہ کیا ہوتا تو ان کو اردو شعرا سے یہ شکایت نہیں ہوتی کہ اردو شعرا صرف غزل کے رسیا ہیں اور نظم میں جو ترتیب، تنظیم اور ارتقاء ہوتا ہے، وہ ان کے بس کی بات نہیں۔اس کیساتھ انہوں نے یہ بات بھی کہی ہے کہ اردو شعراء فارسی شاعری کے اسیر رہے اور یوں فارسی شاعری کے اثر نے انہیں کہیں کا نہیں رکھا"۔اردو شاعری میں فارسی روایت کی پیروری بعد میں اور شمالی ہند میں پیدا ہوئی۔لیکن دکن میں بقول جمیل جالبی "ہندوی روایت" کا بڑی حد تک بول بالا رہا۔کلیم الدین احمد قصیدہ نگار ی کے تعلق سے لکھتے ہیں؛" قصیدے کی شان وشوکت کے لحاظ سے فارسی اور عربی الفاظ کثرت سے مستعمل ہوتے ہیں، جن سے شان وشوکت تو ہاتھ آجاتی ہے لیکن اثر ضائع ہوجاتا ہے" (اردو شاعری پر ایک نظر ۷۷)

یہ بیان بھی دکنی شاعری سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔دکنی شعراء نے شعوری طور پر عربی، فارسی الفاظ کم سے کم استعمال کئے ہیں، اور وہ اس خصوصیت کو فخریہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔جمیل جالبی احمد گجراتی کی مثنوی "یوسف زلیخا" کے حوالے سے لکھتے ہیں؛

"وہ فارسی عربی کے الفاظ کو کم سے کم استعمال کرنے پر زور دیتا ہے، جس کا اظہار اس نے خود "یوسف زلیخا" میں کیا ہے؛

عرب الفاظ اس قصے میں کم لیاؤں نہ عربی فارسی بھوتیک میلاؤں (تاریخ ادب اردو، جلد ا)

دکنی شاعری میں بعض جگہ نہ صرف شعوری طور پر عربی اور فارسی الفاظ کم سے کم استعمال کرنے کی کوشش کی گئی، بلکہ اس کے ساتھ ہندو اساطیر اور دیو مالا کو بھی پیش کیا گیا، بہت ہی احترام کے ساتھ پیش کیا گیا۔

ابراھیم عادل شاہ ثانی جگت گرو نے اپنی کتاب "نورس" میں اپنا حلیہ جو بیان کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی تہذیب اور معاشرت سے اس کو کتنی جذباتی وابستگی تھی، وہ اپنا حلیہ اس

طرح بیان کرتا ہے؛

"ایک ہاتھ میں ساز ہے، دوسرے ہاتھ میں کتاب جس کو دیکھتا ہے، اور نورس کے گیت گاتا ہے۔ اس کا لباس زعفرانی ہے، دانت کالے اور ناخن میں مہندی لگی ہے، بڑا میر خنداور محبت کرنے والا ہے، اس کے گلے میں بلور کی مالا پڑی ہے۔ اس کا عزیز شہر بدیا پور (بیجاپور)، اور محبوب سواری ہاتھی ہے۔ ابراھیم کے باپ علم کے دیوتا گنپتی اور ماں پاک سرستی ہے" (بحوالہ تاریخ ادب اردو جلد ا، ۲۱۷)

" کتاب نورس" میں جو گیت ملتے ہیں ہندوستانی راگ راگنیوں میں جو اس نے جدت اور احترام کی تھی اس کے نمونوں میں ان گیتوں میں ہندوستانیت ہی نہیں بلکہ ہندو دیو مالا کے گہرے اثرات ہیں۔ جمیل جالبی نے اس کے ہندوی انداز کے تعلق سے لکھا ہے؛

"ان گیتوں میں ہندو دیو مالا کا اثر گہرا ہے۔ وہ سرستی کو ماں کہتا ہے، اور اس سے زبردست عقیدت کا اظہار کرتا ہے، گنیش، شیو، پاربتی، ہندولت، رام، درگا، اندر کا ذکر محبت اور عقیدت کے ساتھ بار بار کرتا ہے۔ لیکن انہی کے ساتھ وہ آنحضرت اور مرشد خواجہ بندے نواز گیسو دراز کا ذکر بھی بڑی عقیدت کے ساتھ کرتا ہے"

" کتاب نورس" میں ہندوی روایت کا اثر اتنا اور ایسا ہے جس کی مثال اردو شاعری میں کہیں نہیں ملتی، یہاں فارسی کا اثر کہیں نظر نہیں آتا۔ ابراھیم عادل شاہ نے اپنی کتاب نورس میں ہندوستانی راگ راگنیوں کے مطابق گیت ترتیب دیئے ہیں۔ ہر گیت سے پہلے راگ کے نام دیئے گئے ہیں ان میں فارسی کے اثر کا شائبہ تک نہیں ملتا۔ جمیل جالبی ابراھیم کے ان گیتوں کے تعلق سے لکھتے ہیں

" کتاب نورس کے گیتوں کی زبان مشکل ہے اور آج اس سے لطف اندوز ہونا آسان نہیں، اس کا ایک سبب تو یہ ہے موسیقی کی فکر اور زبان پر سنسکرتی تہذیب کی گہری چھاپ ہے۔ اسی لئے زبان و بیان، تلمیحات، اور اشارات، ہندو دیو مالا، کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں، دوسرے یہ کہ بیجاپور کے ادبی

اسلوب وہیئت پر شروع ہی سے یہ ہندوی رنگ گہرا رہا ہے" (تاریخ ادب اردو جلد ا، ۲۱۸)

ایسے حضرات جو اردو شاعری کو فارسی زدہ کہتے ہیں، اور اس بات کا گلہ کرتے ہیں کہ اردو شاعروں نے ایران کے ماحول وہاں کے دریاؤں اور پہاڑوں کا ذکر کیا ہے، وہاں کے پرندوں اور موسموں کو تو بیان کرتے ہیں لیکن ہندوستانی ماحول کو پیش نہیں کرتے۔ ایسے تمام لوگ دکنی اردو ادب سے لاعلمی کی وجہ سے ایسا کہتے ہیں، مذکورہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہے کہ دکنی شاعری ہندوستانیت کو اس درجہ اپنائے ہوئے تھے کہ ہندوؤں کے دیویوں اور دیوتاؤں کو بھی بڑے احترام سے پیش کرتے ہیں؛

اردو شاعری میں جو غزل گوئی کا چرچا حد سے زیادہ ہوا ہے، اتنا اور ایسا کہ غزل اور اردو شاعری کی آبرو بن گئی۔ اور اسی کو بعضوں نے ہدف ملامت بنایا ہے۔ اس کی وجہ بھی دکنی شاعری سے لاعلمی ہے مولانا حالؔی نے سب سے پہلے اردو شاعری میں غزل گوئی میں جو مقبولیت حاصل کی۔ اس کا ذکر اپنی کتاب "مقدمہ شعر وشاعری ولؔی" میں کیا ہے۔ لیکن ان کو سامنے بھی دکنی شاعری کا شرمایہ نہیں تھا۔ انہوں نے مثنوی کو اردو شاعری مفید اور کارآمد صنف سخن کہا ہے، اور اس بات پر افسوس کا اظہا کیا ہے کہ اس صنف سے جو کام لیا جانا چاہیئے تھا وہ اردو شاعری نے نہیں کیا اور اس کو بھی صرف حسن وعشق کی باتوں تک محدود رکھا۔ حالانکہ دنی شعراء نے اس صنف سخن کی وشعت اور افادیت سے پورا پورا فائدہ اٹھای۔ اس کے ذریعہ رشد وہدایت کا بھی کام لیا۔ مذہب واخلاق کی باتیں بھی بیان کیں۔ بزم آرائیوں اور عشقیہ داستانیں بھی بیان کیں، جنگ وجدل اور رزم کی حالت وکیفت بھی پیش کی۔ کلیم الدین احمد نے ترقی پسند تحریک کے زیر اثر نظم نگاری کو جو کسی قدر فروغ حاصل ہوا اس کی تفصیل بیان کرنے کے بعد آخر میں وہ لکھتے ہیں:

"اردو شاعری میں ایک انقلاب رونما ہوا لیکن غزل کی اہمیت اور ہر دل عزیزی میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوائی۔ آج بھی غزلوں کی وہی فراوانی ہے۔ جو عصر حاضر سے پہلے تھی،" (اردو شاعر پر ایک نظر ۱۸۹)

دکنی شعراوادب کا سرمایہ اگر کلیم الدین احمد کے سامنے ہوتا تو ان کو پتا چلتا کہ ۱۳۵۰ء سے لے کر ۱۷۰۷ء تک دکنی شاعری میں مثنوی کی " فراوانی " ملتیہے ،غزل گوئی برائے نام ہے۔ دکنی شاعری کے بڑے اور عظیم کارنامے سے مثنوی اور نظم ہی کی شکل میں ملتے ہیں: دکنی شعروادب کا مطالعہ مذکورہ بالا وجوہات کی بنا پر بے حد اہم حد درجہ ضروری اور ناگزیر ہے۔

1.3 نمونہ امتحانی سوالات:

سوال ۱: دکنی ادب کی مطالعے کی اہمیت اور ضرورت پر روشنی ڈالیے۔

سوال ۲: دکنی زبان ایک ایسی زبان ہے جس میں ہمارا بیش بہا ادبی سرمایہ موجود ہے۔ وضاحت کیجئے۔

ان سوالوں کے جواب 1.2 میں ملاحظہ فرمائیں۔

1.4 خلاصہ:

اس اکائی میں دکنی زبان کی اہمیت اور ضرورت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دکنی زبان میں کئی زبانوں کے الفاظ شامل ہو گئے ہیں۔ جو زبان جنوبی ہندوستانی میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اسے دکنی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، اور یہی زبان کچھ عرصہ بعد شمال میں اردو کے نام سے مشہور ہوئی۔ بعض مورخین کے اعتراضات کا جواب بھی دکنی زبان کے مطالعے کے بعد مل جاتا ہے۔ دکنی الفاظ کا تلفظ بھی ملتا ہے۔ اس زبان میں مختلف زبانوں کے الفاظ بھی شامل ہو گئے ہیں۔ سنسکرت سے لے کر پنجابی کے الفاظ تک اس زبان میں شامل ہیں۔ فارسی الفاظ بھی ہیں۔ یہ تمام الفاظ دکنی میں مل گئے ہیں اور ذخیرہ ءالفاظ کو بڑھانے میں مدد دیتے ہیں۔ ایک اور خصوصیت اس زبان کی یہ ہے کہ ہندو اساطیر اور دیو مالائی عناصر کو بھی استعمال کیا گیا ہے، اس طرح سے ہندوستانی عناثر کی نشاندہی ہی مختلف دکنی مثنویوں میں کی جاسکتی ہے۔ جیسے نصرتی کی " گلشنِ عشق " وغیرہ۔ اکائی کے آخر میں نمونہ ء

امتحانی سوالات اور فرہنگ بھی دی گئی ہے۔ سفارش کردہ کتابوں کے نام بھی درج ہیں۔

1.4 فرہنگ:

لفظ	معنی	لفظ	معنی
سرج	سورج	منگنا	مانگنا
دھنڈنا	ڈھونڈنا	پرم	پریم
پرت	پریت	اُپر	اوپر
ہتّی	ہاتھی	سجن	ساجن
بدل	بادل	بُند	بوند
اسمان	آسمان	دُسرا	دوسرا

1.5 سفارش کردہ کتابیں:

۱۔ دکنی ادب کی تاریخ — ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ

۲۔ تاریخ زبان اردو — ڈاکٹر جمیل جالبیؔ

اکائی ۲: اردوے قدیم یا دکنی کی لسانی خصوصیات:

ساخت

2.0 اغراض ومقاصد

2.1 اردوے قدیم یا دکنی کی لسانی خصوصیات

2.1.1 دکنی کی لسانی خصوصیات کا تقابل نواح دہلی کی بولیوں سے

2.2 نمونہ امتحانی سوالات

2.3 خلاصہ

2.4 فرہنگ

2.5 سفارشی کتب

2.0 اغراض ومقاصد:

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ حسب ذیل باتوں سے واقف ہو جائیں گے؛

☆ اردوے قدیم اور دکنی کو الگ الگ سمجھنے کے اسباب

☆ شمالی ہند کی قدیم اردو اور دکنی زبان کی یکسانیت

☆ اردو قدیم یا دکنی کی لسانی خصوصیات

2.1 تمہید:

اردوے قدیم اور دکنی ایک ہی زبان کے دو نام ہیں۔ موجودہ اردو اور قدیم اردو یا دکنی ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں اس وجہ سے بعض لوگ ان دونوں زبانوں کو الگ الگ سمجھ لیتے ہیں۔ اب سمجھنے والوں میں بڑے بڑے اہلِ علم اور اہلِ قلم رہے ہیں۔ سر سید احمد خان جیسا عالم فاضل شخص

بھی دکنی کو اردو سے الگ سمجھتا تھا۔ لیکن وہ لوگ جن کی نظر میں اردو زبان کا ارتقاء تھا انہوں نے ایسی غلطی نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی اردو اور دکنی کو الگ الگ زبانیں نہیں سمجھتا۔ دکنی کو وہ اردو کی "ایک شاخ" کہتا ہے۔ اور اردو کتابوں کے ساتھ دکنی کتابوں کا بھی ذکر کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے پیش نظر اردو زبان کا پورا ارتقا تھا۔

قدیم اردو میں جو الفاظ شمالی ہند میں استعمال ہوتے تھے، وہی الفاظ دکنی میں استعمال ہوتے تھے۔ لیکن بعد میں جب دکن کا علاقہ آزاد ہوا تو شمالی ہند میں فارسی سے مسلسل ربط کی وجہ سے وہاں کی اردو فارسی کے زیر اثر آ گئی لیکن دکن کی اردو فارسی کے اثر سے بڑی حد تک آزاد رہ کر نشو ونما پانے لگی۔ اس وجہ سے شمالی ہند کی اردو اور دکنی اردو میں بڑا فرق پیدا ہو گیا۔ اگر ہم قدیم اردو اور دکنی اردو کی لسانی خصوصیات کا گہری نظر سے مطالعہ کرتے ہیں دونوں کی خصوصیات مشترک نظر آتی ہیں۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اردو ے قدیم اور دکنی ایک ہی ہے۔

3۔ اردو قدیم یا دکنی کی لسانی خصوصیات

دکنی در حقیقت قدیم اردو ہے لیکن محض لوگ جدید اردو اور دکنی کو دو الگ الگ زبانیں سمجھتے ہیں۔ اگر عام آدمی ایسا سمجھیں تو ایک بات بھی ہے لیکن بعض اہل علم اور اہلِ قلم بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جدید اردو اور قدیم اردو یا دکنی اس قدر الگ اور مختلف ہیں کہ وہ لوگ جن کے پیش نظر اردو زبان کا ارتقاء نہیں ہے۔ وہ جدید اردو اور دکنی کو دو الگ الگ زبانیں سمجھنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ جن کی نظر میں اردو زبان کا ارتقائی سفر رہا ہے انہوں نے کبھی یہ بات نہیں کہی۔ ہمارے سامنے دو قد آور ادبی شخصیتیں ہیں۔ جن میں سے ایک نے دکنی کو اردو سے الگ سمجھ لیا۔ اس لئے کہ اردو زبان کا ارتقاء ان کے سامنے نہیں تھا۔ دوسرے نے دکنی اور اردو کو کبھی الگ نہیں سمجھا اس لئے کہ اردو زبان کا ارتقاء اس کے پیش نظر تھا۔ یہ دو شخصیتیں کوئی اور نہیں

بلکہ سرسید احمد خان اور گارساں دتاسی ہیں۔ دونوں انیسویں صدی کے ہم عصر تھے۔ گارساں دتاسی فرانس کی ایک یونیورسٹی میں اردو کا پروفیسر تھا۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ نے اپنی کتاب گارساں دتاسی میں اس کے تعلق سے لکھا ہے:

"اردو کے قدیم ادب پر تحقیقی کام کی ابتداء کا سہرا گارساں دتاسی کے سر ہے۔ وہ سوربون یونی ورسٹی پیرس میں اردو کے استاد تھے، انہوں نے یہ کام ۱۸۳۵ء میں شروع کیا اور تقریباً پچاس سال تک وہ اس میں مصروف رہے"

دتاسی کے پیش نظر اردو زبان کا پورا ارتقاء تھا۔ اسی لئے دکنی اور اردو کو وہ الگ الگ نہیں سمجھتا بلکہ ایک ہی زبان و ادب قرار دیتا ہے۔ وہ اردو کی ابتداء کو مسلمانوں کی آمد سے وابستہ کرتا ہے۔ بعض تاریخی تبدیلیوں سے زبانوں کے ارتقاء پر اثر پڑتا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

"۸۰۰ء کے آغاز ہی میں مسلمان ہندوستان میں فاتح کی حیثیت سے پہنچے۔ محمود غزنوی نے ۱۰۰۰ء کے لگ بھگ سب سے بڑھ کر شاندار فتوحات حاصل کیں اور اسی وقت سے شہروں میں ہندوستانی بانکا میں تغیر واقع ہوا"

بعد میں وہ بتاتا ہے کہ بابر کے زمانے میں اردو نمایاں صورت میں ابھر کر سامنے آئی۔ وہ لکھتا ہے؛

"اس وقت ہندوستانی زبان فارسی زبان میں گھل مل گئی جس میں عرب فاتحوں کے تسلط اور مذہب کی بدولت بے شمار عربی الفاظ بھی حائل ہو گئے تھے اور اس عجیب و غریب آمیزش سے ہندوستانی، آریانی، اور سامی لہروں کا سنگم بن گئی جو ایک قسم کی نہایت غیر معمولی لسانی ترکیب ہے"

اردو زبان کے ارتقاء کو پیش نظر رکھنے کا نتیجہ ہے کہ وہ شمالی ہند کی اردو اور دکنی کو ایک ہی زبان کے دو حصے سمجھتا ہے۔ اس لئے لکھتا ہے؛

"اس طرح دہری ہند اسلامی زبان وجود میں آ گئی یعنی شمالی زبان اور جنوبی زبان، شمال کی

ہندوستانی کواردو کا نام ملا کیونکہ اسی نے شاہی اردو میں جنم لیا تھا، اور جنوب یا دکھن کی دکنی کہلائی"

دتاسی کے اس بیان سے ظاہر ہے کہ وہ اردو" ہی کو ہندوستانی کہتا ہے۔ دتاسی یہ بھی بخوبی جانتا ہے کہ اردو پیدا تو ہوئی شمالی ہند میں لیکن اس کو فروغ حاصل ہوا دکن میں۔ اور یہ کہ دکن میں شمال سے بہت پہلے ادبی اغراض کے لئے استعمال ہوئی اور اس میں اعلیٰ درجے کی شاعری ہوئی جس کی وجہ سے شمالی ہند والوں کو بھی معلوم ہوا کہ اردو میں اعلیٰ درجے کی شاعری کی جاسکتی ہے۔ شمالی ہند میں فارسی ہی میں شاعری کی جاتی تھی۔ دکنی کی اعلیٰ درجے کی شاعری کا علم جب شمال والوں کو ہوا تو انہوں نے تب کہیں جا کر اردو میں شاعری کی۔ دتاسی کے کہنے کے مطابق؛

"اس کے بعد پھر جنوب ہی میں اس بولی میں جسے دکنی کہتے ہیں، ریختہ اشعار لکھے گئے۔ یہی طرز آخر کار شمال کے شاعروں نے اپنی نظموں کے لئے اختیار کیا۔ وہاں اس سے قبل فارسی مستعمل تھی"

دتاسی دکنی ادب سے پوری طرح واقف تھا، اور اردو میں شمالی ہند میں جو کام ہو رہا تھا، اس سے بھی واقف تھا، اور دکن میں جو کام ہو چکا تھا، اور ہو رہا تھا، اس سے بھی واقف تھا۔ اس نے اپنی کتاب " تاریخ و بیان ہندوی اور ہندوستانی" میں شمالی ہند کے ہزاروں شاعروں کا ذکر کیا ہے، وہیں دکنی کے صدہا شاعروں کا ذکر کیا ہے، اس تعلق سے خود اس نے لکھا ہے؛

" تین ہزار مصنف جن کا میں نے ذکر کیا ہے ٹھیٹ دکنی میں لکھنے والے کوئی دو سو ہیں"

چونکہ اس کو پورا علم تھا کہ اردو زبان کی تعلیم اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ شمالی ہند کے ادبی نمونوں کے ساتھ دکنی ادب کو بھی نہ پڑھایا جائے۔ اسی وجہ سے وہ لکھتا ہے؛

" میں اس سال باغ و بہار۔۔۔۔ پڑھاؤں گا، یہ کتاب خالص ہندوستانی زبان میں لکھی گئی ہے۔ ساتھ ہی " کامروپ" کے کارناموں کی تحسین الدین والے ایڈیشن سے تشریح کروں گا، یہ کتاب دکنی زبان میں ہے"

گارساں دتاسی کے برخلاف سرسید جیسا عالم فاضل شخص چونکہ اردو زبان کے ارتقاء کو پیشِ نظر

نہیں رکھتا اس لئے "دکنی" کو اردو سے الگ زبان سمجھ لیتا ہے۔ سرسید کو گارساں دتاسی نے اپنی کتاب "تاریخ ادبیات ہندوی اور ہندوستانی" بھیجی تھی۔ سرسید نے اپنے اخبار "سائنٹفک سوسائٹی" گزٹ مورخہ ۱۱ ستمبر ۱۸۶۸ء میں اس کتاب کے تعلق سے لکھا ہے؛

"گارساں دتاسی صاحب نے جن کا نام نامی یورپ کے علمی مجالس میں نہایت مشہور ہے اور جنہوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ مشرقی زبانوں کی تحصیل میں صرف کیا ہے ملک فرانس سے ہمارے پاس ایسی کتاب بھیجی ہے جس میں ہندوستانی زبان کی تحقیق کی گئی ہے۔ مگر اس کتاب کے مصنف نے ہندوستانی زبان سے ایک وسیع معنی مراد لئے ہیں، جس میں ہندی، اردو، دکنی زبانیں سب شامل ہیں"

اردو ہی ہندی بھی کہلائی، ہندوی اور دکنی بھی، "گارساں دتاسی، اور بعض دوسرے متشرقین نے اسے ہندوستانی بھی کہا ہے، لیکن سرسید زبان کے ان مختلف ناموں کو الگ الگ زبانیں سمجھ لیتے ہیں۔ انہوں نے جب دتاسی کی کتاب میں بار بار دکھنی کا نام دیکھا تو اس کے تعلق سے یہ لکھا کہ اردو اور دکنی الگ زبانیں ہین۔ وہ لکھتے ہیں؛

"جب کہ اکبر کی سلطنت کا عہد آیا اور مسلمانوں کی سلطنت جم گئی تو یہ فارسی زبان جس میں پہلے سے عربی کے لفظ بہت سے ملے ہوتے تھے ہندوستان کی زبانوں سے بلا تکلف مل جل کر ہندوستان کے جنوبی حصہ میں ایک نئی زبان مستعمل ہوگئی جس کو دکنی کہنے لگے اور شمالی حصے میں ایک اور زبان قائم ہوگئی جس کو اردو کہنے لگے اور انجام کار اردو زبان کو بڑی ترقی حاصل ہوئی مگر ابتداء میں دکنی زبان سے بہت پیچھے رائج ہوتی تھی، اور دکنی زبان جس طرح سے پہلے رائج ہوئی تھی ایسے ہی وہ اب گمنام بھی ہوگئی"

اردو اور دکنی کو دو الگ الگ زبانیں سمجھنے والے اب بھی موجود ہیں۔ حالانکہ قدیم اردو اور دکنی کی خصوصیات کو اگر ہم جان لیں تو ہم ایسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہو سکتے؛

دکنی یا اردو ے قدیم کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ یہ دوسری ہندوستانی زبانوں سے

بہت قریب تھی۔ اور صرفی نحوی لحاظ سے ہندوستانی زبانوں کی بہت سی خصوصیات اس میں ملتی ہیں۔ دکنی میں ہندوستان کی مختلف زبانوں کے جو الفاظ ملتے ہیں اس کے تعلق سے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں؛

"اس دور کی زبان میں ہمیں مختلف زبانوں کی ایک کھچڑی سی پکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ جس میں مقامی زبانوں کے علاوہ کھڑی بولی، برج بھاشا، اودھی، سرائیکی، پنجابی، راجستھانی، سنسکرت اور گجری وغیرہ کے اثرات ایک ساتھ پک رہے ہیں۔ عربی، فارسی ترکی الفاظ اس کھچڑی زبان میں ایک حلاوت پیدا کر کے اسے ایک نیا رنگ دے رہے ہیں عربی فارسی، کے لسانی وتہذیبی اثرات نے زبان کا خمیر اٹھنے اور جلد پک کر تیار ہو جانے کے عمل میں ملا دی۔" (تاریخ ادب اردو ۱۹۷)

قدیم اردو اور دکنی میں حقیقت میں کوئی فرق نہیں تھا۔ قدیم اردو جب دکن پہنچی تو دکنی کہلوائی۔ ڈاکٹر مسعود حسن خان نے اردو زبان کی تاریخ کی جو تحقیقی کام کیا ہے اس میں انہوں نے ہر جگہ یہ بات بتائی ہے کہ قدیم اردو اور دکنی ایک ہی زبان کے دو نام ہیں۔ وہ "معراج العاشقین" کی زبان کے تعلق سے یہ "حکم" لگاتے ہیں کہ

"وہ چودھویں صدی عیسوی کی "زبان دہلوی" کی نشان دہی کرتی ہے" (مقدمہ تاریخ زبان اردو ۱۴۹)

انہوں نے معراج العاشقین میں استعمال ہونے والے الفاظ کی فہرست یوں دی ہے۔؛

کاڑا (جوشاندہ)، ہور (اور یہ پنجابی اور کھڑی تک ملتا ہے)، نک (ناک)، بارا (ہوا)، پیلانا (پلانا)، لگ (تک)، بوی (بو)، سوں (سے) تے (سے) کوں۔ آپس کوں (اپنے کو)، اے (خود)، کیاں (کی کی جمع)، اگے (آگے)، دُسرا (دوسرا)، تسرا (تیسرا)، اندھارا (اندھیرا)، اجیالا (اجالا)، نئیں (نہیں)، لک (لاکھ)، سیریاں (میری کی جمع)، رک (رکھ)، اے (یہ) پینے (پہنے)، باج (بغیر)، دسنا (دکھائی دینا)، بیٹ (بیٹھ)، سی (سے)، منا (منع)۔

"معراج العاشقین" کی زبان کا مقابلہ، ڈاکٹر مسعود حسین کے کہنے کے مطابق اگر دکنی شاعر

نظامی کی زبان سے کیا جائے تو نظامی کی زبان کی قدامت مسلم ہو جاتی ہے۔ دکنی زبان پر شمالی ہند کی زبان کے اثرات کے تعلق سے ڈاکٹر مسعود حسین خان لکھتے ہیں:

"نظامی کی زبان میں نہ صرف راجستھانی اور پنجابی کی اکثر شکلیں پائی جاتی ہیں بلکہ اس پر آب بھرنشی روایات کا ٹھپہ بھی صاف نظر آتا ہے۔ اس بنا پر قیاس بھی کرنا پڑتا ہے۔ کہ اس میں نواح دہلی کی ایک سے زائد بولیوں کے اثرات پہنچے ہیں" (مقدمہ تاریخ زبان اردو، ۱۵۰)

ڈاکٹر مسعود حسین خان نے اپنی کتاب "مقدمہء تاریخ زبان اردو" کے پانچویں اور آخری باب میں مختلف دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ دکنی اصل میں قدیم اردو ہی ہے۔ اسی وجہ سے وہ شمالی ہند کی مختلف بولیوں سے متاثر ہے، دکنی اور شمالی ہند کی مختلف بولیوں میں لسانی خصوصیت یکساں ہے، اسی وجہ سے انہوں نے اپنے آخری باب کا عنوان حسب ذیل دیا ہے؛

"پانچواں باب"

تشکیل: ایک نئے لسانی نظریے کی:

2..4 دکنی کی لسانی خصوصیات کا تقابل نواح دہلی کی بولیوں سے

اس باب میں ڈاکٹر مسعود حسین خان نے جگہ جگہ دکنی، ہریانی، کھڑی بولی، اور میواتی سے اردو کا تقابل کر کے یہ بتایا ہے کہ

"دکنی زبان کے تقریباً تمام حروف نواح دہلی کی بولیوں میں رائج ہیں" (مقدمہ تاریخ زبان اردو ۲۴۶)

دکنی میں "ان" لگا کر جمع بنانے کا طریقہ ملتا ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان کے کہنے کے مطابق میرٹھ، مظفر نگر، اور سہارنپور میں آج بھی ملتا ہے۔ ادبی سطح پر بھی یہ استعمال ہوتا تھا، قدیم شمالی ہند کے شاعر فائز اور حاکم کے اشعار سے ڈاکٹر مسعود خان نے اپنے اس دعوے کو مدلل بنا دیا ہے"

دوبھواں تیغ جنوبی سی دراز (فائز)

لب پر گلوں کے ہر کر بے ان لباں کا رنگ (حاتم)

دکنی میں "میرا" کی بجائے میج یا منج اور تیسرا کی بجائے تج استعمال ہوتا ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان اس تعلق سے لکھتے ہیں؛

"قدما کے یہاں اس کی کثرت سے مثالیں مل جاتی ہیں، جس سے ثابت ہے کہ یہ دکنی سے مخصوص نہیں مثلاً حاتم کے یہاں "تم ساتھ "تجھ گل بدن کی بو "تج عشق "تجھ پاس (فائز) "نجن پاس (فائز) (مقدمہ تاریخ زبان اردو)

اسی طرح "ہمنا"، "ہمن کو"، "تمنا"، "تمن کو" بھی صرف دکنی کی خصوصیت نہیں ہیں۔ ڈاکٹر مسعود حسین کہتے ہیں کہ حاتم کے کلام میں اس کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ وہ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں حضرت کمال الدین مخدوم شیخ، سعدی کا کوروی کا حسب ذیل شعر پیش کرتے ہیں۔ جس میں ضمائر کی یہ شکلیں مل جاتی ہیں۔؛

ہمنا تمن کو دل دیا، تم دل لیا اور دکھ دیا ہم یہ کیا، تم وہ کیا، ایسی بھلی یہ پیت ہے

"ہمن" میں اور "ہمن کو" کی دکنی شکلیں، ڈاکٹر مسعود حسین کی تحقیق کے مطابق قدیم اردو میں رائج تھیں۔ جیسے چندر بھان کے اسی مصرع میں خدا نے کسی شہر اندر ہمن کو لا کے ڈالا ہے۔ دکنی کا سوں افضل جھنجھانوی نے استعمال کیا ہے؛ سنی دل سوں، کبھی دیکھی من کوں

ڈاکٹر مسعود حسین خان کہتے ہیں کہ دکنی ضمائر میں قابل ذکر آپس ہے قلی سے لے کر ولی تک ہر ایک کے کلام میں مل جاتے ہیں۔ یہ بھی افضل کے بارہ ماسہ میں مل جاتے ہیں؛

اری سبزک پیا کے باغ جا کر آپس کوں بے وفا سہتی لوکا

ڈاکٹر مسعود حسین خان یہ ثابت کرتے ہیں کہ دکنی کے تقریباً تمام حروف نواح دہلی کی بولیوں میں قدیم زمانے سے رائج ہیں۔ جیسے سینی، سیتے، تھے، سوں، ستیں، لگوں، لگ، لگن، پہ، پو، ڈاکٹر مسعود

حسین خان نے یہ بتایا ہے یہ تمام حروف "فائز، آبرو، حاتم اور دیگر متقدین کے یہاں بار بار آتے جس کیلیئے وہ مثال کے طور پر یہ مصرعے پیش کرتے ہیں؛

تاثر، آدھر اس کے یاقوت سیتی، بیس بیش، عقیق یمن لب ستی،

آبرو:

شعر کو مضمون ستے جو قدر رہی ہے آبرو قافیہ سیتے ملایا قافیا تو کیا ہوا

حاتم: دل میں طمع نہیں مجھے مشاہ و گدا ستے میں سب کو چھوڑ ساز کیا ہوں خدا ستے

اس کے علاوہ دکنی کے اور دوسرے حروف اور الفاظ جو دکنی کی خصوصیت سمجھے جاتے ہیں۔ وہ سب کے سب شمالی ہند کے قدیم اردو اور وہاں کی بولیوں میں مل جاتے ہیں۔ یہاں ان الفاظ کی فہرست دی جارہی ہے۔ جو دکنی زبان کی خصوصیت میں شمار کئے جاتے ہیں، لیکن اصل میں وہ قدیم اردو میں شامل تھے۔

ہور (اور)، دھر یا دھیر (سمت)، کدھیں (کبھی) تاول (جلد) اتا، جتا، (اتنا، جتنا)، وستاد (استاد)، اچھا (ہونا)، دسنا (دیسنا، دکھائی دینا)، پتینا (یقین کرنا)، اپچنا (اگنا)، سبونا (پرورش)، رچ (خوشی)، ناؤں اور کھاؤں (نام اور جگہ)۔ کہوانا، کاڑنا (نکالنا)۔

مذکورہ بالا تمام الفاظ دینے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں؛

"ہمارے خیال میں مرہٹی اور گجراتی زبان کے بعض لسانی اثرات کو چھوڑ کر دکنی کے تمام غریب الفاظ کی توجیہ نواح دہلی کی چار بولیوں (ہریانی، کھڑی، میواتی، اور برج)، سے کی جاسکتی ہے۔ اس کے برخلاف دکن میں اجنبی بولیوں کے ماحول میں یہ لسانی ارتقاء بالکل رک جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دکنی زبان میں الفاظ کی وہی شکلیں ملتی ہیں، جو شمالی ہند میں آج سے نو سو برس پہلے رائج تھیں، یا جو اب صرف گھریلو اور دیہاتی زبان میں پائی جاتی ہیں۔ ("مقدمہ تاریخ زبان اردو")

ڈاکٹر مسعود حسین خان کی تحقیق کے مطابق دکنی یا قدیم اردو اصل میں دہلی کی بولیوں کی ارتقاء کی صورت ہے، وہ لکھتے ہیں؛

"اردو کی ابتداء کے سلسلے میں تحقیق کی جو سمت اس تصنیف میں مقرر کی گئی ہے، تمام تر نئے مواد سے اس کی تصدیق ہوتی ہے، نواحِ دہلی کے قدیم نمونے جوں جوں روشنی میں آتے جائیں گے۔ یہ بات بھی واضح ہوتی جائیگی کہ دکنی کا ماخذ یہی بولیاں ہیں۔ دکن میں یہ بولیاں دہلوی کی ایک ایسی شکل میں پہنچتی ہیں جب وہ سیال تھیں۔ اور اس پر مختلف لسانی اثرات کارفرما تھے۔ شمالی ہند میں ارتقاء کا عمل متقدمین شعرائے دہلی بلکہ دبستانِ لکھنو تک جاری رہا۔ جب کہ دکن میں قلی قطب شاہ اور وجہی کے ادبی نمونوں میں اس کا روپ متعین ہو جاتا ہے۔

اس لئے نواح دہلی کی بولیاں اردو کا اصل منبع اور سرچشمہ ہیں اور حضرت دہلی اس کا صحیح مولود و منشہ (مقدمہ تاریخ زبان اردو ۲۹۸)

قدیم اردو جس طرح سارے ہندوستان میں پھیل رہی تھی اور ایک عالم گیر حیثیت اختیار کر رہی تھی۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر مسعود حسین خان لکھتے ہیں:

"اس عہد کے مذہبی پیشواؤں کو شعوری اور غیر شعوری طور پر یہ احساس ہو گیا تھا کہ ان کا عالم گیر پیغام ایک عالم گیر زبان میں ہونا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ نامکر بونے مرہٹواڑی، (مرہٹواڑہ) میں کبیر داس نے پورب اور گرونانک نے پنجاب میں بیٹھ کر لشکریوں اور بیوپاریوں کے ذریعے پھیلتی ہوئی اس زبان کو اپنایا جسے خسرو نے "زبان دہلوی" کے نام سے یاد کیا ہے (مقدمہ تاریخ زبان اردو ۱۵۲)

قدیم اردو، ہندوستان کے دور دراز علاقوں تک جس طرح پہنچ رہی تھی اس کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر مسعود حسین خان لکھتے ہیں؛

"دہلی کے مرکز سے جو نئی لسانی لہریں تمام ہندوستان میں پھیل رہی تھیں ان کا عکس ہمیں دکن کے ادب

دراز گوشے سے ایک شام ناریو کے کلام تک میں مل جاتا ہے" (تاریخ زبان اردو ۱۵۲)

"والا" کے لئے ہارا کا لفظ دکنی میں آتا ہے، لیکن یہ شمالی ہند کی دوسری زبانوں میں بھی ملتا ہے ۔ڈاکٹر مسعود حسین خان لکھتے ہیں:

"لفظ "والا" مابعد کا ارتقاء ہے ۔ قدیم دکنی، ہریانی، پنجابی اور برج میں ہمیشہ "ہارا" آیا ہے، جیسے جانہارا، پانہارا، (مقدمہ ءتاریخِ زبان اردو ۱۴۳)

دکنی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں سنسکرت کے بہت سے الفاظ ملتے ہیں بعض جگہ تو یہ اپنی خالص شکل میں ہیں اور بعض جگہ اپنی مرضی اور ضرورت کے مطابق انہیں بدل دیا گیا ہے ۔ڈاکٹر مسعود حسین خان لکھتے ہیں:

"جدید آریائی زبانیں جب ادبی شکل اختیار کرتی ہیں تو انہس خواہ مخواں سنسکرت کا سہارا لینا پڑتا ہے ۔ مسلمانوں کی آمد سے سنسکرتیت کے اس رجحان کو زبردست صدمہ پہنچا ۔ انہوں نے اپنا خزانہء الفاظ بیشتر فارسی اور عربی سے لیا۔ اور ہندوستانی الفاظ کی صحت کی مطلق پرواہ نہ کی چنانچہ دکنی ادبیات میں سنکرت کے اکثر الفاظ توڑ مرور کر ذیل کی شکل میں ملتے ہیں؛

پرم، پیم، (پریم)، دشٹی (درشٹی ،نظر)، چمن (چمبن، چومنا)، انجھو (اشرو= آنسو)، سیتل (شیتل ،ٹھنڈا)، بست (دوستو: چیز، (،کیس (کیش: بال)،، وغیرہ۔

سنسکرتیت کے اس رجحان کی وجہ سے بہت سے الفاظ دکنی میں استعمال ہوتے ہیں جو خالص شکل میں ہیں ۔ دکنی زبان و ادب کی یہ بھی خاص خصوصیت ہے کہ اس میں سنسکرت کے خالص الفاظ بڑی تعداد میں ملتے ہیں، ڈاکٹر مسعود حسین خان لکھتے ہیں؛

"سنسکرتیت کے اس بڑھتے ہوئے عام رجحان سے مسلمانوں کو بھی مفر نہ تھا، اس کی شہادت اس میں قدیم دکنی ادب سے ملتی ہے، جہاں خالص سنسکرت کے بے شمار الفاظ بلا تکلف نظم و نثر میں

استعمال کیے گئے ہیں:

میگھ، (بادل)، دوت (بیا حبر)، ترلوک (تینوں عالم)، چتر (ہوشیار)، جیو (جی)، چرن (قدم)، چنتا (فکر)، دنکر (دن کرنے والا یعنی سورج)، درپن (آئینہ)، سور (سورج)، روی (سورج)، رکت (خون)، شبد (لفظ)، سنگرام (لڑائی۹، سیس (سر)، ہردے (دل)، اَدھک (زیادہ)، بہو (بہت)، وانر (بندر)، الک (زلف)، پرگٹ (ظاہر)، وینا (بین)، انتر (راز)، بھان (سورج)، پستک (کتاب)، وغیرہ۔

قدیم دکنی، قدیم اردو ہی تھی، افضل کی مشہور "بارہ ماسہ" یا بکٹ کہانی شمالی ہند کی قدیم زبان کو نمونہ ہے، وہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ قدیم اردو جب دکن آئی تو وہ دکنی کہلوائی، ڈاکٹر مسعود حسین خان لکھتے ہیں:

"افضل کی زبان کا لسانی تجزیہ کیا جائے تو قدیم دکنی کی ابتدا پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اور یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے، کہ دکنی زبان کا جواز ہریانی اور ہندوستانی (کھڑی، یا زبان دہلوی)، پیش کیا جا سکتا ہے، گو کئی لحاظ سے افضل کی اردو، دکنی کے مقابلے میں ارتقاء یافتہ ہے"

اس کے بعد انہوں نے اسماء، ضمائر، حروف اور افعال، افضل نے جو استعمال ہیں وہی دکنی کی کتابوں جس طرح ملتے ہی، ان کو پیش کیا ہے۔

"ہم کوں، آپس کوں (دکنی میں بھی ملتا ہے)، ہمن سے (ہم سے دکنی میں بھی ملتا ہے)،

حروف: کن، کوں (دکنی کے مطابق، باج، (بغیر، پیا باج، پیالہ پیا جائے نا) سوں سیس، (دکنی کے مطابق)

اس سلسلے میں ڈاکٹر مسعود حسین خان نے شاہ سید برکت اللہ بارہروی کا کلام پیش کیا ہے۔ شاہ برکت اللہ کے کلام میں بہت سے الفاظ اسی طرح ملتے ہیں جو دکنی میں ہیں۔ ذیل میں ان الفاظ کی

نشاندہی کی گئی ہے؛

گھر تج کے جا جنگل میں پر تب سمجھ پری تکیہ جو مخملی دو گر سج چھوڑ کے

جب اینٹ زیر سیس دھری تب سمجھ پری

ڈاکٹر مسعود حسین خان نے لکھا ہے:

"قدیم اردو میں بیشتر "ڈ" کی آواز ملتی ہے، (ڑ) کی آواز اٹھارویں صدی کی ابتداء کا ارتقاء ہے۔ (ڑ) کی آواز آج بھی پنجابی، راجستھانی، ہریانی، اور کھڑی بولی کے بعض اضلاع (میرٹھ، مظفر نگر، سہارنپور)، میں عام مستعمل ہے۔۔۔

بڈا	بجائے	بڑا
کھڈی	بجائے	ٹھوری
گڈھا	بجائے	گڑھا
علی گڈھ	بجائے	علی گڑھ

دکنی میں بھی قدیم اردو کی طرح "ڈ" کی آواز ہی ملتی ہے، جس سے ہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ دکنی قدیم اردو دوسری ہندوستانی زبانوں سے زیادہ قریب تھی۔ دکنی کے ایسے الفاظ جو اب اس کی خصوصیت سمجھے جاتے ہیں، وہ شمالی ہند کی قدیم اردو میں بھی استعمال ہوتے تھے۔ لیکن مظہر خان جانجاں حاتم اور پھر ناسخ نے جو اصلاح زبان کی تحریکیں چلائیں ان کی وجہ سے ٹھیٹ ہندستانی الفاظ کی جگہ بعض عربی فارسی کے الفاظ استعمال ہونے لگے، ڈاکٹر مسعود حسین خان، نے متروک الفاظ کی لمبی فہرست دی ہے۔ جو حسب ذیل ہے۔

نین (چشم) ساجن (معشوق)، جگ (دنیا)، درشن (زیارت) ماس (گوشت)، منسا (تجویز)، موہن (معشوق)، پیو (دوست)، پیا (معشوق)، برہا (فراق)، من (دل)، سنسار (دنیا)، باٹ (راستہ)، درس (دیدار)، دارو (دوا)، پیتم (معشوق)، سریجن (معشوق)،

سُرج (سورج)، جیو (جی)، بیجلی (بجلی)، جھٹا (جھوٹا)، چند (چاند)، نمن (طرح)، بھیتر (اندر)، سیس، سوں سیتی (سے)، انگے (آگے)، نبا (بن)، باج (بغیر)، سنیں سنے (میں)، وجا، دوج (دوسرا)، لگ (تک)، کن (پاس)، کوں (کو)، نزیک نرک (نزدیک)، کدھی، کدھیں (کبھی)، اتا (اتنا)، نئیں (نہیں)، تجنا (چھوڑنا)، اتھا (تھا)، چھے (ہے)، کیتا (کیا)، جالے (جلدئے)، بوچھنا (سمجھنا)، گلنا (پگھلنا) م، کئی (کوئی)، آپس (اپنے)، تمنا (تمہارے)۔

"اں" لگا کر جمع بنانے کا قاعدہ گو فارسی کا ہے، اور شاید فارسی ہی کے اثر سے پنجابی میں بھی یہی قاعدہ ملتا ہے، مثال کے طور پر یار سے یاراں، ہم نفس سے ہم نفساں وغیرہ دکنی میں بھی جمع "اں" لگا کر بنائی جاتی ہے۔ لیکن یہ قاعدہ پنجابی کے علاوہ ہریانی اور راجستھانی میں بھی ملتا ہے۔ مسعود حسین خان لکھتے ہیں:

> "جمع میں حالت مفعولی کا اختتام اردو کے برخلاف اکثر "ن" پر ہوتا ہے، جیسے، ناں، عورتاں، وغیرہ یہ شکل ہریانی، راجستھانی، اور پنجابی میں عام ہے، دکنی کی بھی یہی خصوصیت ہے (مقدمہ تاریخ زبان اردو ۹۱)

صیغہ ماضی میں (یا)، لگانا دکنی میں عالم ہے جیسے 'بوچھا'، کی جگہ "پوچھا" لیکن یہ صرف دکنی ہی میں نہیں قدیم اردو اور ہریانی میں بھی ملتا ہے، ڈاکٹر مسعود حسین خان لکھتے ہیں:

"پوچھیا کی ترکیبیں، ہرانی اور قدیم اردو د (دکنی) دونوں میں پائی جاتی ہیں" (مقدمہ تاریخ زبان اردو ۱۰۱)

"سی" علامت مستقبل کے طور پر شمالی ہند کی قدیم اردو میں رائج تھی۔ اور دکنی میں بھی رائج تھی۔ مسعود حسین خان نے امیر خسرو کے پیر بھائی حضرت روشن چراغ دہلوی کی تصنیف "خیر المجالس" سے یہ فقرہ نقل کیا ہے۔

"ارے مولانا یہ بدا ہواسی" یعنی ارے مولانا ایسی مرد بزرگ خواہد شد"، پھر وہ بتاتے ہیں کہ دکنی میں بھی "سی" علامت مستقبل کے طور پر استعمال ہوتی تھی،

جس عشق کا کچھ درد اس کتاب کو سینے پر تے ہلاسی نا، اس کتاب بغیر اپنا وقت بھلاسی نا"

اس کے بعد وہ احمد اور ولی کے اشعار پیش کرتے ہیں جس میں "سی" علامت مستقبل کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔

کدھیں سج سک سنگ لمسی نہ منجہ　　کدھیں من کمل پھول کھل سی نہ منجہ

کہا ہے زہر کا تاثیر اس میں　　نہ چل سی کچھ میری تدبیر اس میں

پھر وہ لکھتے ہیں کہ یہ صرف دکنی یا قدیم اردو کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ ہندوستان کی کئی زبانوں میں یہ صورت ملتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"پروفیسر شیرانی نے اس (سی) کا تعلق ملتانی سے بتایا ہے۔ حالانکہ مغربی ہندوستان کی اکثر زبانوں (مثلاً)، گجراتی، مارواڑی، جے پوری، میں یہ آج تک بقیہ استعمال ہوتی ہے، دہلی کے مضافات بالخصوص ضلع گوڑ گاؤں کی بولیوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ یہاں سے یہ قدیم دہلی کے بازاروں میں عام طور پر رائج ہوگئی ہوگی" (مقدمہ تاریخ زبان اردو ۱۴۵)

اردو کے لئے "ہندوستانی" کا لفظ انگریزوں سے بہت پہلے رائج ہو چکا تھا، ڈاکٹر مسعود حسین خان لکھتے ہیں:

"شاہ جہاں کی فارسی تصنیفات میں ہندی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی کا لفظ بھی زبان کے لئے عام طور پر ملتا ہے۔ عبدالحمید لاہوری نے اس لفظ کو بار ہا استعمال کیا ہے۔۔ ڈاکٹر سلمان ندوی اور پروفیسر شیرانی دونوں کا خیال ہے کہ لفظ "ہندوستانی" زبان کے سلسلے میں اس عہد سے قدیم ہے"

سید سلیمان ندوی اور پروفیسر شیرانی نے لکھا ہے کہ ابراھیم عادل شاہ ۹۸۸ء، (۹۸۸ء تا

۱۰۳۷ء) فارسی دانی کے سلسلے میں مشہور مورخ فرشتہ نے ہندوستانی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ بعد میں ملا وجہی نے بھی "سب رس" (۱۴۳۵) میں "زبان ہندوستان" کی ترکیب استعمال کی ہے۔،

بہت سے لفظ جو دکنی کی خصوصیت سمجھے جاتے ہیں اردوے قدیم اور شمالی ہند کی مختلف زبانون اور بولیں میں بھی مل جاتے ہیں، جیسے وہی کے لئے وہیں کا لفظ خالق باری، میں بھی ملتا ہے اور سب رس میں بھی، ڈاکٹر مسعود حسین خان لکھتے ہیں:

"ان کے علاوہ کوں، توں، وغیرہ تو ہر صفحہ پر مل جائیں گے، غنہ آواز کی پیدائش جدید آریائی زبانوں کی مشترک عالم گیر خصوصیت ہے۔ توں (تو)، پنجابی سے لے کر دکنی، ہریانی، کھڑی بولی، راجستھانی اور برج بھاشا تک میں یکساں طور پر قدیم زمانے سے مستعمل ہے" (مقدمہ تاریخ زبان اردو ۲۳۷)

فعل میں جمع کا ہفتہ صرف دکنی کی خصوصیت نہیں ہے، جیسے عورتاں آئیاں، یہ قدیم اردو میں بھی کثرت سے استعمال ہوتا تھا۔ جیسے سودا نے لکھا ہے

یہ انکھیاں کیوں مرے جی کے گلے کا ہار ہو پڑیاں

(اور حاتم کہتے ہیں)

جب سے تیری ادائیں عالم کو بھائیں ہیں تب سے جہاں میں تو نے دھومیں مچائیاں ہیں

اس تعلق سے ڈاکٹر مسعود حسین خان لکھتے ہیں؛

"مذکورہ بالا لسانی خصوصیات کے متعلق یہ کہنا کہ اردوئے قدیم یا دکنی نے پنجابی سے لی ہوں گی، محض بے بنیاد (قیاس آرائی ہوگی، یہی مرخی خصوصیات دہلی کے قرب وجوار کی بولیوں میں اج بھی لکھی جاتی ہیں" (مقدمہ تاریخ زبان اردو ۲۳۱)

پھر وہ بتاتے ہیں کہ شمالی ہند کے مختلف ادیبوں اور شاعروں نے جمع بنانے کے لئے 'اں" کا استعمال کیا ہے، وہ لکھتے ہیں؛

"قدیم ترین مصنفوں میں محمد افضل اور عبدی، شیخ محبوب عالم اساکن جھجر، وغیرہ کے یہاں ملتی ہیں مثلاً دن کی جمع (دناں)، کھیت کی جمع کھیتیاں، گھر کی جمع گھراں وغیرہ آج بھی ہریانہ کے علاقہ میں بولی جاتی ہیں۔ شیخ محبوب عالم کے محشر نامہ میں اسی نہج پر نگراں، غریباں، جھوٹاں، اونٹاں، وغیرہ ملتی ہیں"

آتیاں، جاتیاں، کے تعلق سے ڈاکٹر مسعود حسین خان نے لکھا ہے:

"اسی طرح سے آئیاں، جائیں وغیرہ حاتم، میر اور سودا سے لکر لکھنو میں میر انیس اور دہلی میں داغ تک نے باندھا ہے۔، راقم البطور نے خود دہلی کی بڑھیوں کی زبان سے اس قسم کے میغے سنے ہیں" (مقدمہ تاریخ زبان اردو ۲۳۲)

البتہ مفت کی بھی جمع بنانے کا طریقہ خاص دکنی کی خصوصیت ہے، جیسے کلیاں گوریاں، سکیاں

کوں جگ میں جوتھیاں سو بسریا کونلی سکی کوں دیکھتا میں سلا بھولیا دکن میں (محمد قلی قطب شاہ)

کچیاں کونلیاں کنواریاں، ناریاں کلیاں کوں نوروز آیا،

محمد صدقے قطبا کوں انداں سوں ملایا ہے، (محمد قلی قطب شاہ)

دجہی سب رس میں لکھتا ہے:

عورتاں بچاریاں، بہت بھلیاں ہیں (سب رس)

رو رو کے نیل پڑی ہیں نیلیاں انکھیان ہویا بھی

تو دل میں روی صورت ہے جو جھڑک گئے نیلے پر (ہاشمی)

ضمائر کے لئے دکنی میں جتنے الفاظ ملتے ہیں، وہ شاید ہندوستان کی کسی بھی زبان میں نہیں ملتے، ڈاکٹر حبیب نے دکنی ضمائر کی پور تفصیل دی ہے؛

ضمیر متکلم: حالتِ فاعلی: میں، اپے، ہم ہمن، ہمنا، ہجے، ہمیں

حالتِ مفعولی: مجے، منجے، مجہ، منج، مج کوں، ہمنا، ہمنا کوں

حالتِ اضافی: ھو، مج، منج، ہمن، ہمارا

ضمیر مخاطب: حالت فاعلی، توں، تو، تم، تمن، تمنا، تمیں، تمہیں

حالتِ مفعولی: تج، تجھ، تجے، تج کوں، تمن، تمنا کوں

حالتِ اضافی: تو، تج، توج، تجھ، تیرا، تم، غن، ٹمنا، تمارا،

ضمیر غائب: حالتِ فاعلی: وہ، وو، او، وے، انے، اُن، اونو، وے

حالتِ مفعولی: اس، اس کوں، اسے، انوں کوں، انہوں کوں، ان کوں

حالتِ افسانی: ون کا، انن، افو کا، اینو کا

ضمیر موصول: حالت فاعلی: جو، جیو، جے، جن، جن نے، جنے، جنے، جن کا قبو جنہوں

حالتِ مفعولی: جسے، جس کوں، جنوں کو

حالت اضافی: جس کا، جنوں کا

ضمیر استفہام: حالت فاعلی: کوں کن، کنے، کوں، کن

حالتِ مفعولی، کسے، کس، کس کوں، کئے کوں

حالتِ اضافی: کس، کن کا

ضمیر اشارہ قریب: یوں، اے، یے

ضمیر اشارہ بعید: وو

ضمیر تنکیر: کچھ، کچ، کوچ،

وہ افعال جو معلق فعل زمان کہلاتے ہیں۔ دکنی میں کئی ملتے ہیں ان افعال سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی فعل کس زمانے میں واقع ہوا۔

۱۔ اب کے لئے، انا، اِتال، ایتال

۲۔ جب کے لئے جداں، جدھال، جوا

۳۔ تب کے لئے تدھاں، تو،

۴۔اول کے لئے، پیچھے، پچھیں، پچھیں

۵۔جلدی کے لئے ترت، بیگی، بیگ

۶۔ہمیشہ کے لئے جم، سدا

متعلق فعلِ استفہام، جس میں فعل کے بارے میں پوچھا جاتا ہے، دکنی میں ذیل کے الفاظ ملتے ہیں؛

کیوں کے ل ء: کی، کے، کاہے، کاہے کوں، کائیکوں، کس دھات،

ڈاکٹر حبیب ضیا نے لکھا ہے:

" کیوں " کے لئے " کے " کا استعمال دکنی کے لئے خاص ہے، اردو میں یہ لفظ ان معنوں میں کبھی استعمال نہیں ہوا "

مثال میں انہوں نے یہ شعر پیش کیا ہے؛

مونین میلا نے بیس کے بھی کے نہ آوتے

مجلس ہماری کوں نہیں در پاں کا افتتاح (دکنی زبان کی قواعد ۱۹۱)

متعلق فعل مدد میں یک بار کے علاوہ دو بار کے لئے "دو جی بار" سو بار کے لئے "صد بار"، متعلق فعل مقدار میں اتا کے لئے "بتا" جتنے کے "جتا."

مرکب متعلق فعل کی سے کسی فعل کی وضاحت ہوتی ہے، دکنی میں اس کی بھی کئی صورتیں ملتی ہیں؛

۱۔کئیں، کا کئیں، آسے پاسے

۲۔جاں تلک، وھاں تلک، جولگ، رب لگ، جدھاں لگ، حاں لگوں۔

۳۔جگ، تلگ، جولگن، کوتلک۔

علامت اضافت: اردو میں علامت کا، کے کی ہے۔لیکن دکنی ان کے ساتھ علامت اضافت قدیم شکلیں بھی بہت استعمال ہوتی ہیں۔کا کے کرا اور کیرا، کے کے لئے کیرے، کی کے لئے کری اور کیری۔

حروفِ جار: اسم یا ضمیر کا تعلق فعل یا صفت کے ساتھ ظاہر کرنے والے حروفِ جار کہلاتے ہیں۔اردو

میں 'سے"، "ئیں"، تک، اور پر استعمال ہوتے ہیں، دکنی میں ان کے علاوہ حروف جار کی کئی صورتیں لئے ہیں:

"سے" کے لئے سوں "سی"، سیتی سیتیں، سینھتیں، رتیں، سے، سبھے، تھے، تے۔

تک، کے لئے تلگ، لگ، لگھوں، لگن

پر کے لئے اُپر، اُپرال، پو، پہ

الفاظ کی تکرار سے عموماً بعض وقت تاکید، بعض جگہ مبالغہ کبھی تفہیم اور کبھی کثرت کا مفہوم پیدا کیا جاتا ہے۔ دکنی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صرف لفظ کی تکرار نہیں ہوتی، بلکہ 'ے' کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ جیسے بال بال کی جگہ بالے بال، رگ کی جگہ رگے رگ، جنگل جنگل کی جگہ جنگلے جنگل بن بن کی جگہ بنے بن وغیرہ ڈاکٹر حبیب ضیان اس سلسلے میں اشعار بھی پیش کئے ہیں، جس میں مذکورہ بالا الفاظ کی تکرار دکنی زبان کی اس خصوصیت پر روشنی ڈالتی ہے۔

رگے رگ بالے بال نے وچہ نام　　دھڑکتا نکلتا اچھے جسم مدام

کرم کے بھار نیں نکلے نیس تو　　گھرے گھر غلفلا درزور ہوتا

ونڈلا کے دندے انے چھوڑ گھروا　　ہو جنگلے جنگل فرار پکڑے

اگر تج ساسروکئیں ہور ہتا　　بنے بن بلبلاں کا شعور ہوتا

الفاظ کی تکرار کے سلسلے میں دکنی میں "ے" کے علاوہ "ی"، "ن" کا بھی استعمال ہوتا ہے، جیسے؛

عشق، نے کھیل کھیلیا، ٹھاریں ٹھار　　(ماخوذ دکنی زبان کی قواعد)

حروف عطف و جملوں یا کلموں کو ملاتے ہیں: اردو میں "اور"، 'و" اور "یا" حروف عطف ہیں۔ اردو کے عام قاعدے کے مطابق ایک ساتھ دو حروف عطف نہیں آتے لیکن دکنی زبان کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں بعض وقت دو حروف عطف آتے ہیں، جیسے

قدر عنا و ہور ٹکتا چال (محمد قلی)

اسی طرح "و" اور یا ایک ساتھ

ہمیں کیا جو ہمناے کچ خیر ہو

اس نفس پر حب و یا بیر ہو (نصرتی) (دکنی زبان کی قواعد، ۲۲۷ تا ۲۲۴)

حروف استدراک: دو جملوں کے درمیاں حروف (استدراک آتے ہیں پہلے جملے میں جو شبہ ہوتا ہے، اسے یہ حروف دوسرے جملے میں رفع کر دیتے ہیں؛ اردو میں لیکن، مگر، گر چہ، بلکہ حروف استداراک ہیں، دکنی میں گو، مذکورہ بالا حروف استدارک استعمال ہوتے ہیں لیکن خاص دکنی کے حروف استدارک

، لے، پن اور اتا ہیں

ا۔ بعضے کتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ کوں قیامت میں دیکھیں گے

وے حیران ہوئیں گے کہہ ناسکیں گے (وجہی)

۲۔ بات جدا ایں بھید، سچ (وجہی)

۳۔ جلے کیوں کر کہ جیو کا کھیل نہیں تھا

بتی ساری تھی رما تیل سنیں تھا (ابن نشاطی)

حروف استشنا: حروف ایک چیز یا شخص کو دوسرے سے الگ کرتے ہیں لیکن اردو میں "میں "بغیر اور بجز ملتے ہیں، دکنی میں ان کے بن، نبا، اور باج بھی ملتے ہیں، جسے:

پیا باج پیالہ پیا جائے نا

پیا باج یک تل جیا جائے نا (قلی قطب شاہ)

وہاں دسایا نہ تھا کوئی علی باج (وجہی)

تجھ بن او نہ کوئی نا خالق دو جا ہوئی

حروف تخصیص اردو میں کئی ہیں، ہر، بھی، تو، ہی لیکن جو دکنی کے لئے مخصوص ہیں وہ بھی کی جگہ بی جیسے

انوx بی یو نخفی اسرار یوں کتے ہی اظہار

اردو اور دکنی دونوں میں ہی ، یہی وہی استعمال ہوتے ہیں لیکن کا مخصوص حرف تخصیص 'چ" ہے۔ یہ مراہٹی زبان کے اثر سے آیا ہے۔

وے حیران ہوئیں گے کہہ نا سکیں گے کہ یونچہ ہے یا ایسا چ ہے (وجہی)

اسی طرح اتنا ہی کے لئے "اتناچ" ویسا ہی کے لے "ویساچ" اپنا ہی کے لئے ،اپنچ ، تیرا ہی کے لئے تیراچ، دکنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

حروف تشبیہ: ایک دوسرے کے مانند قرار دینے کے لئے آتے ہیں، اردو اور دکنی میں مانند، سی، سا کے حروف آتے ہیں لیکن مخصوص دکنی کے حروف تشبیہ حسب ذیل ہیں؛

ناہ، نمن، نمنے ، سار

چلی پانی پہ کشتی باد کے ہر　　فلک کے ناو کس جاگے پہ ناٹھار (ابن نشاطی)

کیا سکھ وطن واں عزیزاں کی سار　　کیا دکھ سو ندیاں نمن جگ تے بھار (نصرتی)

رگ رگ وہ خوش روح نمنے سرس　　جلگ دینے ہارا اتھا رنگ رس (نصرتی)

اردو میں پریشانی، حیرانی اور سرگردانی استعمال ہوتے ہیں لیکن دکنی میں پریشانی کی جگہ پریشانگی، حیرانی کے لئے حیرانگی، اور مروانی کے لئے سرگرادانگی استعمال ہوتئے ہیں جیسے۔

لٹ کو اس کی پریشانگی پر اس کی حیرانگی پر اس کی سرگردانگی پر مہر آئی"

موجودہ اردو اور دکنی میں اب اتنا فرق آ گیا ہے کہ دکنی کو ایک الگ زبان بعض لوگ سمجھ لیتے ہیں۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ وہ لوگ جن کے پیش نظر اردو زبان کا پورا ارتقاء ہے وہ ایسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں رہ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے گارساں وتاسی نے اردو اور دکنی کو الگ زبانیں سمجھنے کی غلطی نہیں کی تھی ، اردو زبان کی تاریخ پر موجودہ زمانے میں جو کام ہوا ہے۔ اس سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ قدیم اردو ہی دکنی ہے، اور دکنی ہی قدیم اردو ہے۔

2.5 نمونہ امتحانی سوالات:

۱۔ دکنی زبان کے تعلق سے سرسید کے کیا خیالات تھے؟

۲۔ دکنی زبان کو گارساں دتاسی اردو سے الگ کیوں نہیں سمجھتا تھا، بیان کیجئے۔

۳۔ دکنی یا اردوے قدیم کی سب اہم خصوصیت کیا تھی بیان کیجئے۔

۴۔ مسعود حسین خان قدیم اردو اور دکنی کو ایک زبان کہتے ہیں، اس سلسلے میں انہوں نے جو دلائل دیئے ہیں ان کا جائزہ لیجئے۔

2.6 خلاصہ:

قدیم اردو اور دکنی ایک ہی زبان کے دو نام ہیں لیکن، موجودہ اردو اور دکنی زبان میں اس قدر فرق ہے کہ بعض لوگ دکنی کو الگ زبان سمجھتے ہیں اور اردو کو الگ زبان سمجھتے ہیں۔ اردو اور دکنی کو الگ الگ زبانیں سمجھنے والے عالم لوگ ہی نہیں بلکہ ان میں عالم فاضل لوگ بھی شامل ہیں۔

گارساں دتاسی نے ایک کتاب "تاریخ ادبیات ہندوی اور ہندوستانی" لکھی تھی۔ جب یہ کتاب سرسید کو ملی تو انہوں نے اپنے اخبار "سائنٹفک سوسائٹی گزٹ" میں لکھا کہ شمال میں ایک زبان قائم ہوگئی جس کو اردو کہنے لگے، اور دکنی کے تعلق سے لکھا کہ جنوبی حصہ میں ایک نئی زبان مستعمل ہوگئی جس کو دکنی کہنے لگے، اس کے برخلاف گارساں دتاسی اردو اور دکنی کو ایک ہی زبان سمجھتا ہے۔ مسلمانوں کی آمد کی وجہ سے جو لسانی تغیرات ہوئے اس کی وجہ سے اردو وجود میں آئی۔ اور یہ بتاتا ہے کہ شمالی اور جنوبی ہند میں ایک ہی زبان رائج ہوئی وہ لکھتا ہے۔

"اس طرح دہری ہند اسلامی زبان وجود میں آگئی، یعنی شمالی زبان اور جنوبی زبان۔ شمال کی ہندوستانی کو اردو کا نام ملا کیونکہ اسی نے شاہی اردو میں جنم لیا تھا، اور جنوب یا دکن کی دکنی کہلائی"

دتاسی پیرس کی سوربون یونیورسٹی میں اردو کا استاد تھا، وہ ۱۸۶۵ سے ۱۸۷۵ء تک کوئی پچاس

سال تک ہر سال کے ختم پر ایک لکچر دیا کرتا تھا، جس میں سال بھر کی اردو زبان و ادب کی سرگرمیوں کا جائزہ ہوتا تھا۔ گارسان کے یہ خطبات فرانسیسی میں ہوتے تھے، لیکن ان کا اردو میں ترجمہ "خطبا گارساں دتاسی" کے عنوان سے ہوا ہے۔ وہ جہاں شمالی ہند میں لکھی ہوئی اردو کی کتابوں جیسے "باغ و بہار" کو پڑھاتا تھا، وہیں دکنی مثنوی "کامروپ" پر بھی لکچر دیتا تھا، بہر حال وہ لوگ جو تاریخ زبان سے واقف ہیں اردو اور دکنی کو الگ زبانیں سمجھنے کی غلطی نہیں کر سکتے۔

دکنی یا قدیم اردو کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ زبان دوسری ہندوستانی زبانوں سے بہت قریب تھی۔ جیسا ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے کہ دکنی میں مقامی زبانوں کے علاوہ کھڑی بوی، برج بھاشا، اودھی، سراٹکی، پنجابی، راجستھانی، سنسکرت، کے اثرات ایک ساتھ ملتے ہیں۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان نے اپنی کتاب "مقدمہ تاریخ زبان اردو" میں یہ ثابت کیا ہے کہ شمالی ہند میں وہی زبان پیدا ہوئی اور کافی مدت تک یہاں پھلنے پھولنے کے بعد اس نے دکن کا رخ کیا اور وہاں اپنی قدیم شکل میں قائم ہو گئی، کیونکہ جنوب میں دوسری بولیاں تھیں، انہوں نے لکھا ہے؛

> "ہمارے خیال میں مرہٹی اور گجراتی زبان کے بعض لسانی اثرات کو چھوڑ کر دکنی زبان کے تمام الفاظ تو جیہہ نواح دہلی کی چار بولیوں (ہریانی، کھڑی، میواتی اور برج) سے کی جا سکتی ہے۔ اس کے برخلاف دکن میں اجنبی بولیوں کے ماحول میں یہ لسانی ارتقاء بالکل رک جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دکنی زبان میں الفاظ کی وہی شکلیں ملتی ہیں جو شمالی ہند میں آج سے نو سو برس پہلے رائج تھیں یا جو اب گھریلو اور دیہاتی زبان میں پائی جاتی ہیں"

ڈاکٹر مسعود حسین خان نے اردو کے قدیم شعرا جیسے حاتم، فائز، افضل جھنجھانوی، شیخ محبوب عالم، سید برکت اللہ مارہروی، کے کلام کے نمونے دے کر یہ بات ثابت کی ہے کہ جو الفاظ اور حروف آج دکنی کی خصوصیت سمجھے جاتے ہیں وہ اصل میں قدیم اردو میں بھی مستعمل ہوتے تھے، شمالی ہند کی ہی زبان جب جنوبی ہند پہنچی تو وہ دکنی کہلائی۔ شمالی ہند کی اردو میں تیزی سے تبدیلیاں آئیں اس کی سب سے بڑی وجہ تو یہ تھی کہ شمالی ہند میں فارسی کا غلبہ رہا، دوسرے وہاں تیزی سے لسانی حالات بدل

رہے تھے۔اور تمام زبانوں میں جو تبدیلیاں ہو چکی تھیں وہ اردو میں بھی رونما ہو رہی تھیں۔اس کے بر خلاف جنوب میں مرہٹی، اور گجراتی کو چھوڑ کر قدیم اردو یا دکنی، مارواڑی زبانوں میں گھری ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ سیاسی حالات بھی ایسے پیدا ہوئے کہ دکن میں فارسی کا غلبہ بہت کم ہو گیا، دکنی کو شاہی سرپرستی بھی حاصل ہو گئی۔ دکن کے حکمراں جب آزاد ہوئے تو انہوں نے ہر صورت میں اپنی خود مختاری کو قائم رکھنے کی کوشش کی اور اپنی شناخت بنائی۔اور یوں شاہی سرپرستی کی وجہ سے دکنی کو ایک وقار اور منزلت حاصل ہوئی۔اس میں اضافہ اس وجہ سے بھی ہوا کہ دکنی اب ادبی سطح پر استعمال ہونے لگی۔ان تمام حالات نے دکنی کے علاوہ اردو کو وہ مقام بخشا جو شمالی ہند کی اردو کو تین سو سال بعد حاصل ہوا۔تین سو سال کے اس فرق کی وجہ سے دکنی یا قدیم اردو کی صورت موجودہ اردو سے اتنی مختلف ہو گئی کہ اب وہ الگ الگ سی معلوم ہوتی ہیں۔لیکن دونوں ایک ہی ہیں۔

2.7 فرہنگ:

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
مستشرق	مغربی عالم جو مشرقی علم و زبان کا ماہر ہو۔		
نواح	اطراف و اکناف	اسماء	اسما کی جمع
ضمائر	ضمیر کی جمع	تعمیم	عمومیت، عام کرنا
منزلت	رتبہ، درجہ	استفہام	پوچھنا، سوال
استدارک	پوچھنا،		

2.8 سفارشی کتب:

ا۔تاریخ ادب اردو ڈاکٹر جمیل جالبی

۲۔مقدمہ ءتاریخ زبان اردو	ڈاکٹرمسعود حسین خان
۳۔دکنی زبان کی قواعد	ڈاکٹرحبیب ضیا
۴۔ہندوستانی لسانیات	ڈاکٹرمحی الدین قادری زورؔ
۵۔پنجاب میں اردو	پروفیسرمحمود شیرانی
۶۔خطابت گارساں وتاسی	ڈاکٹر گارساں وتاسی
۷۔گارساں وتاسی	ڈاکٹرمحی الدین قادری زور

اکائی ۳: بہمنی عہد کی لسانی اور ادبی خدمات

ساخت

3.0 اغراض ومقاصد

3.1 تمہید

3.2 بہمنی عہد میں اردو کی لسانی اور ادبی خدمات

3.3 بہمنی دور کے علمی وادبی کارنامے

3.4 نمونہ امتحانی سوالات

3.5 خلاصہ

3.6 فرہنگ

3.7 سفارشی کتب

3.0 اغراض ومقاصد:

اس کائی کے مطالعے کے بعد مندرجہ ذیل باتوں سے واقف ہو جائیں گے،

☆ شمالی ہند سے اردو دکن کس طرح پہنچی

☆ اردو زبان وادب کو دکن میں فروغ دینے میں کون سے تاریخی اور سیاسی عوامل نے کام کیا۔

☆ بہمنی عہد کے بادشاہوں نے اردو زبان وادب کو فروغ دینے میں کیا اور کتنا کام کیا۔

☆ بہمنی عہد کے شاعروں اور ادیبوں کی لسانی خدمات

3.2 تمہید

اردو شمالی ہند میں پیدا ہوئی۔ محمود غزنوی اور محمد غوری نے پنجاب میں اپنی حکومتیں قائم کیں، تو اردو کی ابتدا کی صورت پیدا ہوئی۔ محمد غوری نے دہلی پر قبضہ کر کے جب قطب الدین ایبک کو وہاں کا حاکم بنا دیا تو وہاں مستقل طور پر فارسی اور ترکی بولنے والے آباد ہو گئے۔ مقامی زبانیں الگ تھیں۔ مقامی زبانوں میں جب دوسری زبانوں یعنی فارسی اور کچھ عربی اور ترکی کے بعض الفاظ شامل ہونے لگے اور ایک نئی زبان کی صورت پیدا ہوئی۔ اس کو ہندی یا ہندوی کہا گیا۔ جس طرح حیدر آبادی ہر چیز کو حیدر آبادی کہا جاتا ہے اور عرب کی ہر چیز کو عربی کہا جاتا ہے، ہند کی مناسبت سے ہندیا ہندوستان کی ہر چیز کی ہندی کہا جاتا تھا، اور اب بھی کہا جاتا ہے۔ جیسے عرب میں ہندوستانیوں کو "الہندی" کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اردو بھی مدتوں تک ہندی یا ہندوی کہلائی۔ دہلی میں جب یہ پھلنے پھولنے لگی تو "زبانِ دہلوی" کے نام سے یاد کی گئی۔ علاء الدین خلجی کی فوجوں کے ساتھ گجرات پہنچی تو گجری کہلائی، خلجی اور تغلقی فوجیوں کی زبان پر چڑھ کر جب دکن پہنچی تو دکنی کہلائی۔ دلی کی سخن وری کی داد دیتی ہوئی اس کے ساتھ جب دوباری دلی پہنچتی ہے تو "ریختہ" کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ شاہی لشکر میں جب وہ رہنے لگی تو "اردوئے معلیٰ" کے نام سے مشہور ہوئی۔ بہمنی دور میں وہ صرف بول چال کی زبان نہیں رہی بلکہ ادب کے اونچے درجے پر فائز ہوئی۔

3.2 بہمنی عہد میں اردو کی لسانی اور ادبی خدمات

اردو زبان کا آغاز شمالی ہند میں ہوا۔ وہاں دو تین سو سال تک نشو ونما پانے کے بعد اس نے دکن کا رخ کیا۔ سیاسی حالات و واقعات کی وجہ سے وہ دکن پہنچی۔ علاء الدین خلجی کی سیاسی حکمت عملی کی وجہ سے اردو زبان کو دکن میں پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ علاء الدین ۱۲۹۷ء میں گجرات کو فتح کر کے اپنی سلطنت کا حصہ بنا لیا۔ گجرات کوئی سو سال تک سلطنت دہلی کا حصہ بنا رہا۔ گجرات فتح

کرنے کے بعد ۱۳۱۰ء میں علاء الدین نے دکن اور مالوہ پر حملہ کر کے انہیں بھی فتح کر لیا۔ چونکہ یہ علاقے دہلی سے کافی دور تھے اس لئے یہاں موثر طور پر حکمرانی کرنے کے لئے گجرات، دکن اور مالوہ کے علاقوں کو علاء الدین نے سو سو موضعات میں تقسیم کر دیا۔ اور ہر موضع پر ایک ایک افسر مقرر کر دیا جو "امیر صدہ" کہلاتا تھا۔ امیرانِ صدہ یہاں کے بے تاج بادشاہ ہوا کرتے تھے، مال گزاری وصول کرنے سے لے کر یہاں کا ہر چھوٹا بڑا انتظام ان ہی کے سپرد ہوتا تھا۔ چونکہ انتظامی امور کی انجام دہی کے لئے انہیں مستقل طور پر یہیں رہنا ہوتا تھا، اس لئے وہ اپنے اہل وعیال اور متعلقین کو بھی ساتھ لے آئے تھے۔ دکن اور گجرات ہی کو انہوں نے اپنا وطن بنا لیا تھا۔

امیرانِ صدہ دکن آنے سے پہلے شمالی ہند میں آباد تھے اور وہاں ان کے ابا و اجداد صدیوں سے بسے ہوئے تھے۔ اور اس لئے دربار اور سرکار سے ہٹ کر اردو یا ہندوی ہی سے اپنا کام نکالتے تھے۔ جب گجرات اور دکن میں انہوں نے سکونت اختیار کر لی تو اسی زبان سے اپنا روزمرہ کا کام نکالنے لگے۔ یہی زبان رابطے کی زبان بن گئی تھی۔ بعد کے حالات نے اس صورتِ حال کو اور زیادہ مستحکم کر دیا۔ خلجی کے بعد محمد تغلق نے امیرانِ صدہ کے اس نظام کو نہ صرف باقی رکھا بلکہ اس کو اور مضبوط بنانے کے لئے احکام صادر کئے۔ اس نظام کی وجہ سے اردو زبان کو جو فائدہ حاصل ہوا اس کے بارے میں جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> "اس نظام کی وجہ سے شمال کے لئے دکن اور گجرات کے راستے کھلے رہے، تجارت، لین دین اور دوسرے معاشرتی امور مضبوط تر ہوتے رہے اور ساتھ ساتھ اردو زبان کا حلقہ اثر بھی بڑھتا اور پھیلتا رہا، اور ان علاقوں میں یہ زبان بین الاقوامی زبان کی حیثیت میں پھیلتی پھولتی رہی وقت کے ساتھ ساتھ جب بول چال کی زبان سے گزر کر ادبی سطح پر استعمال میں آئی اور صوفیوں، شاعروں نے اسے اپنے اظہار مقصد کا ذریعہ بنایا تو گجرات میں اس کے ادبی روپ کو "گجری" نام دیا گیا اور دکن میں یہ دکنی کہلائی" (تاریخ ادب اردو ۱۳)

محمد تغلق کے ایک اور تاریخی اقدام نے اردو کو دکن میں مستحکم کرنے میں بڑا اہم حصہ ادا کیا۔ دہلی سے دکن کی دوری کا اندازہ خلجی کو بھی تھا، اسی وجہ سے اس نے امیران صدہ کو مقرر کیا تھا۔ محمد تغلق انتہا پسند بادشاہ تھا۔ اس نے یہ اندازہ کرلیا تھا کہ خود امیرانِ صدہ بھی اس کے قابو سے نکل سکتے ہیں۔ دکن پر اپنی گرفت کو مضبوط ترین بنانے کے لئے اس نے خود پائے تخت کو دہلی سے دولت آباد منتقل کر دیا، اور اس انتقال مکانی پر اس انتہا پسندی سے کام لیا کہ دہلی میں ایک تنفس بھی نہیں رہا۔ اسی طرح ۱۳۴۷ء میں دہلی کی ساری آبادی دولت آباد منتقل ہوگئی۔ اس سارے عمل سے دکنی زبان کو اور قوت سے ساتھ پھلنے پھولنے اور فروغ پانے کا موقع مل گیا۔ بعد میں تغلق نے دکن سے پھر دہلی کو پائے تخت بنایا تو بے شمار لوگ دکن ہی میں رہ گئے۔ اور امیرانِ صدہ کی زہر سایہ آ گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امیرانِ صدہ زیادہ طاقتور ہو گئے۔ اسی لئے محمد تغلق کے آخری زمانے میں تمام امیرانِ صدہ نے متحد ہو کر بغاوت کر دی اور خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اور اپنے میں سے ایک کو بادشاہ بنا دیا۔ ۱۳۴۷ء میں یوں عظیم الشان بہمنی سلطنت کی بنیاد پڑی۔ بہمنی حکومت میں دکنی زبان کے فروغ اور دکنی کلچر کی ابتدا کے بارے میں جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> "اب دکن کی سلطنت شمال سے آئے ہوئے ان ترک خاندانوں کے ہاتھ میں آ گئی تھی جو خود کو دکنی کہنے پر فخر محسوس کرتے تھے۔ دکنی ان کی زبان تھی جس پر انہوں نے دکنی قومیت اور کلچر، کی بنیاد رکھی تھی۔ بہمنی سلطنت کی زبان خانی خان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، ہندوی تھی،" (تاریخ ادب اردو ۱۴)

بہمنی خاندان کا پہلا بادشاہ علاء الدین حسن شاہ بہمنی تھا، بہمنی عہد حکومت ۱۳۵۰ء سے شروع ہو کر ۱۵۴۵ء کو ختم ہوتا ہے۔

بہمنی عہد میں اردو زبان اور ادب کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔ اس کے کئی اسباب تھے۔ قدیم اردو دکنی جو رابطے کی زبان بنی اس کی سب سے اہم اور بڑی وجہ یہ تھی کہ دکن میں دراوڑی

خاندان کی زبانیں کئی تھیں جیسے تلگو، کنڑی، ملیالم اور تامل۔ یہ زبانیں ہند آریائی زبانوں سے اتنی الگ اور مختلف تھیں کہ ان میں سے کوئی بھی زبا بن بنیادی زبان نہین بن سکتی تھی۔ اسی وجہ سے قدیم اردو جس کو بولتے ہوئے خلجی اور تغلق کے زمانے مین دکن کے حاکم مقرر ہوئے انہوں نے اسی کو رابطے کی زبان بنایا۔ اس کے علاوہ قدیم اردو یعنی دکنی کو جو سرکاری اور درباری سرپرستی حاصل ہوئی اس کا اہم سبب سیاسی تھا۔ جب کبھی کوئی ملک اور قوم آزادی حاصل کرتی ہے اور خودمختار ہوتی ہے۔ اس کی تمام تر کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے حاکم ملک اور قوم سے ہر لحاظ سے خودمختار ہو اور الگ ہو۔ وہ ہر ممکن طریقے سے اپنی الگ پہچان اور شناخت بنانے کی کوشش کرتی ہے۔ اس بات کی سب سے بڑی اور روشن مثال امریکا ہے۔ امریکا پر برطانیہ اسی طرح قابظ تھا جس طرح ہندوستان پر تھا۔ امریکا جب برطانیہ کے تسلط سے آزاد ہوا تو اس نے جہاں اپنا جھنڈا اور سکہ علٰیحدہ کیا وہیں انگریزی کو قائم رکھتے ہوئے اس کا لہجہ الگ اور مختلف کرلیا اسی طرح املا مین بھی کئی تبدیلیاں کیں اور برطانوی انگریزی سے اسے ممتاز اور الگ کرنے کی کوشش کی۔ اسی طرح آمدورفت کے برطانیہ کے بالکل برعکس اصول اور ضابطے اختیار کیے۔ برطانیہ میں اور دوسرے بہت سے ممالک سے بائیں طرف سے چلنا ضروری ہوتا ہے، لیکن امریکا میں دائیں جانب سے چلنے کا اصول اختیار کیا گیا۔ بجلی کے کھٹکے برطانیہ میں جب نیچے کی طرف کئے جاتے ہیں تو بجلی چالو ہوتی ہے۔ لیکن امریکا میں کھٹکے اوپر کی جانب کئے جاتے ہیں تو بجلی چالو ہوتی ہے۔ اس طرح آزاد ملک اپنی پہچان اور شناخت بناتے ہیں، بالکل اسی طرح بہمنی سلطنت نے بھی اپنی شناخت بنانے کے لئے مغلیہ سلطنت سے اختلاف کیا۔ جہاں جھنڈا اور سکہ لازمی طور پر الگ ہوئے اور دوسرے بہت سی چیزوں میں اختلاف ہوا وہیں زبان کے سلسلے میں بھی مغلیہ سلطنت سے بہمنی سلطنت نے اپنے آپ کو الگ کیا۔ مغلیہ سلطنت میں فارسی نہ صرف سرکاری اور درباری زبان تھی بلکہ علمی اور ادبی اغراض کے لئے بھی صرف فارسی ہی استعمال ہوتی تھی۔ حد یہ کے اردو کے بڑے سے بڑا شاعر بھی شاعری کے سوا جب کوئی علمی اور ادبی کام انجام دیتا تھا تو وہ فارسی

ہی استعمال کرتا تھا۔ میر، مصحفی، میر حسن قائم چاند پوری اور اس زمانے کے تمام دوسرے شعراء جب اردو شاعروں کا تذکرہ لکھتے تھے تو فارسی ہی میں لکھتے تھے۔ بہمنی عہد میں قدیم اردو یا دکنی پر زیادہ توجہ دی گئی اور کئی اہم دکنی شاعر اس دور میں ملتے ہیں۔

بہمنی دور میں بھی نئی تہذیب اور نئی لسانی روایت قایم ہوئیں اس کے تعلق سے پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

"۱۳۴۷ء مین علاءالدین حسن بہمنی شاہ نے خودمختار حکومت قائم کرلی۔ پہلے پہل اس کا پایہءتخت دولت آباد تھا۔ لیکن جلد ہی اس نے گلبرگہ پائے تخت بنایا اور اس کا نام حسن آباد رکھا۔ بہمنی خاندان کے کل اٹھارہ حکمران ہوئے۔ ان میں بڑے قابل اور علم دوست بادشاہ گزرے ہیں جنہوں نے دکن میں نئی تہذیبی روایات کو ترقی دی اور نئی ادبی اور لسانی روایات کی بنیاد رکھی" (اردو کی ادبی تاریخ ۴۷)

علاءالدین خلجی کے دکن فتح کرنے سے پہلے بھی کئی بزرگ دکن آئے تھے۔ جنہوں نے بڑی خاموشی کے ساتھ "نئی تہذیب اور نئی لسانی روایات" کو فروغ دینے میں بڑا حصہ ادا کیا۔ دکن میں خلجی کے آنے سے پہلے جن بزرگوں کے نام ملتے ہیں ان میں حاجی رومی، سید شاہ مومن، بابا سید مظہر عالم، شاہ جلالالدین گنج رواں، سید احمد کبیر حیات خارجی کی فتح دکن کے بعد جو بزرگ دکن آئے اور جنہون نے ایک نئی زبان کو یہاں ترویج دینے میں اہم کام انجام دیا۔ ان کے تعلق سے جمیل جالبی لکھتے ہیں:

"علاءالدین کی فتح دکن کے بعد روحانی پیشوائی کے اس سلسلے کو اور فروغ حاصل ہوا اور یہاں ہمیں پیر مقصود، پیر جمنا، شاہ منتخب الدین، زرزری بخش میر مٹھے، حضرت گیسودراز، کے والد سید نویت شاہ راجو قتال، شاہ برہان الدین غریب، شیخ ضیالدین اور بہت سے دوسرے صوفیائے کرام دکن کے مختلف علاقوں میں سجادے بچھائے۔ دوستی اخلاق، و تبلیغ دین میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ان بزرگوں نے یہاں کی مقامی زبانوں

کے الفاظ شمال کی زبان میں ملا کر ایک ایسا ہیوالہ تیار کیا جس سے اظہار کی مشکل حل ہوگئی۔ اردو زبان کے ابتدائی ترقی میں ان لوگوں کی نامعلوم کوششیں ناقابلِ فراموش ہیں" (تاریخ ادب اردو ۱۵۱)

بزرگانِ دین کے ملفوظات جو ہم تک پہنچے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زبان پر ہندوستانی زبانوں کے مختلف اثرات پڑ رہے تھے۔ ان کی زبان کو کسی ایک زبان تک محدود نہیں کیا جاسکتا۔ جمیل جالبی نے شاہ برہان الدین غریب زین الدین خلد آبادی، شاہ کوچک ولی، کے ملفوظات کے بارے میں کہا ہے:

"یہ جملے نہ خالص پنجابی ہیں نہ خالص سندھی، سرائکی یا اردو میں مختلف زبانوں کے اثرات ان میں ملے جلے نظر آرہے ہیں"۔

بہمنی عہد کا ابتدائی زمانہ یعنی علاء الدین حسن بہمن شاہ کا زمانہ زیادہ تر اپنی حکومت کو مستحکم بنانے میں گزرا، لیکن اس کے باوجود اس کے زمانے میں کئی علام وفضلا کو پایہ تخت میں مدعو کیا گیا، علاء الدین کے بعد اس کا بیٹا محمد شاہ اول تخت نشین ہوا۔ اس نے بہمنی سلطنت کو پرشکوہ بنانے میں بڑا کام کیا۔ بہمنی دربار کی شان وشوکت اسی کے زمانے میں قائم ہوئی۔ محمد شاہ کے زمانے میں روحانی پیشوا، صوفیا، اور بزرگ گلبرگہ میں تھے۔ وہ جس طرح عوام کی اصلاح کرتے تھے، اور بادشاہ کو بھی راہ راست دکھاتے تھے۔ اور اردو زبان کی ترویج واشاعت کرتے تھے۔ اس کے بارے میں پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

"عوام حتیٰ کے بادشاہوں کے اخلاق وعادات پر نظر رکھتے اور جب ضرورت پڑتی اس کی اصلاح کی کوشش کرتے۔ حضرت زین الدین کے کہنے سے محمد شاہ نے شراب پینا چھوڑ دیا تھا اور حدود سلطنت میں شراب کی دکانیں بند کرادی تھیں۔ حضرت زین الدین کا کام بھی عوام کو رشد وہدایت کرنا تھا۔ اور وہ دکن کے لوگوں کو پرانی اردو ہی میں احکام دین

سمجھاتے تھے،" (اردو کی ادبی تاریخ ۷۰)

محمد شاہ کے زمانے میں حضرت عین الدین گنج العلم کا انتقال ہوا۔ وہ بیجاپور چلے گئے تھے، انہوں نے دکنی عوام ہدایت اور اصلاح کے لئے کچھ رسالے دکنی میں لکھے تھے۔ محمد شاہ کے بعد اس کا بڑا بیٹا مجاہد شاہ اور اس کے بعد علاء الدین کا دوسرا بیٹا داؤد شاہ تخت نشین ہوئے۔ اس زمانے میں امرائے کی کشمکش کی وجہ سے سلطنت کا سکون متاثر ہو گیا تھا۔ بعد میں محمد شاہ ثانی جب تخت نشین ہوا تو شرارتیں کم ہو گئیں اور سکون بحال ہوا۔ محمد شاہ ثانی کے بھی علماء اور شعراء کو اپنے دربار میں مدعو کیا۔ فارسی کے شہرہ آفاق شاعر حافظ کو بھی محمد شاہ نے مدعو کیا تھا۔ لیکن وہ نہیں آئے۔ محمد شاہ خود بھی فارسی کا شاعر تھا، محمد شاہ کے انتقال کے بعد پھر سلطنت میں بے چینی پیدا ہو گئی، اور اقتدار کے لئے وہ رسا کشی شروع ہو گئی۔ جس کی وجہ سے ایک سال کے اندر دو بادشاہ غیاث الدین اور شمس الدین تخت پر بٹھائے بھی گئے اور اتارے بھی گئے۔ البتہ فیروز شاہ کی تخت نشینی کے بعد یہ ہنگامے ختم ہو گئے۔ فیروز شاہ بہمنی خاندان کا آٹھواں بادشاہ تھا اس کے عہد میں سلطنت اپنی تہذیب، علم وفن اور شان وشوکت کے اعتبار سے عروج پر پہنچ گئی، فیروز شاہ علم وادب کی دل سے قدر کرتا تھا اس لئے اس کے دربار میں علماء وصوفیا جمع تھے، فیروز شاہ کے عہد کی ایک خصوصیت یہ رہی کہ حضرت محمد حسینی گیسودراز، گلبرگہ میں رونق افروز ہوئے۔ آپ نے یہاں بھی رشد وہدایت کا سلسلہ جاری رکھا۔ آپ فارسی کے ساتھ کبھی کبھی اردو میں بھی درس دیا کرتے تھے۔ آپ سے کئی تصانیف اردو کی منسوب کی جاتی ہیں۔ معراج العاشقین بھی آپ سے منسوب کی جاتی تھی، لیکن بعد کی تحقیق سے ثابت ہوا کہ یہ آپ کی تصنیف نہیں ہے۔ اس کے علاوہ شکار نامہ، تمثیل نامہ، خلاصہ توحید اور تلاوت الوجود آپ کے نام سے منسوب ہیں۔ آپ نے عورتوں کے لئے بھی ایک چھوٹی سی نظم "چکی نامہ" لکھی تھی۔ آپ کے بڑے فرزند جن کا انتقال آپ ہی کی زندگی میں ہو گیا تھا دکنی کے شاعر تھے۔ آپ کا نام محمد اکبر حسینی تھا۔ آپ نے ایک مختصر سا رسالہ دکنی میں لکھا تھا۔ اس میں بھی وعظ اور نصیحت ملتی ہے۔

فیروز شاہ کے بعد احمد شاہ تخت نشین ہوا۔ اس کو بھی بزرگانِ دین پر اعتقاد تھا اور ان کے ساتھ بے حد عزت اور احترام سے پیش آتا تھا۔ فیروز شاہ کے بعد احمد خان بہمنی سلطنت کے تاج و تخت کا وارث بنا۔ اس نے اپنا پائے تخت گلبرگہ سے بیدر منتقل کیا۔ بیدر میں جو اس نے عالیشان محل اور عمارتیں بنائی تھیں وہ فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ تھیں۔ اس کے زمانے میں کئی ایرانی شاعر بیدر کے دربار میں آئے۔ فارسی کے شاعر افروزی کو احمد شاہ نے ملک الشعرا بنایا تھا۔ آزری دکنی میں بھی شاعری کرتا تھا اور اس نے بہمن نامہ کے نام سے بہمنی سلاطین کی تاریخ لکھی تھی۔ یہ منظوم تھی۔

احمد شاہ کا جانشین علاء الدین ثانی تھا۔ اس کے عہد میں کئی علما اور فضلاء موجود تھے۔ حضرت گیسو دراز کا اسی کے عہد میں انتقال ہوا، اس کے دور میں علمی اور فنی ترقی جاری رہی۔ اس نے قمار بازی اور مے نوشے کو ممنوع قرار دیا تھا۔ علاء الدین ثانی کے بعد ہمایوں شاہ، جسے ظالم کا لقب ملا تھا تخت نشین ہوا۔ جو علماء ہمایوں کے تخت نیشن ہونے کے مخالف تھے جب ہمایوں تخت و تاج حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو ان کو چن چن کر قتل کرنے لگا۔ اس کے باوجود اس کے عہد میں کئی عالم اور شاعر رہے ہیں۔ شاہ طاہر ستر آبادی، اور ملا محمد تقی نظری، اس کے زمانے میں فارسی کے مشہور شاعر تھے نظری دکنی میں بھی شعر کہتا تھا۔ محمود گاوان تجارت کی غرض سے بیدر آئے۔ ہمایوں اس کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر اسے اپنے لشکر کا سالار بنا دیا۔ ہمایوں کے بعد اس کا آٹھ سالہ بیٹا احمد شاہ تالث تخت نشین ہوا۔ لیکن سلطنت کا کاروبار اس کی والدہ ماجدہ نے سنبھال لیا۔ اس خاتون نے بڑی قابلیت کے ساتھ سلطنت پر حکم رانی کی، احمد شاہ کے بعد محمد شاہ لشکری نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ اس کے عہد حکومت میں محمود گاواں نے بہت عروج حاصل کیا۔ اس نے علام و فضلا کی سرپرستی کی ایک بہت بڑا مدرسہ قائم کیا جو آج بھی بیدر میں موجود ہے۔ اس مدرسہ کا ایک بہت بڑا کتب خانہ بھی تھا۔ محمد شاہ نے یوسف عادل خان کو سپہ سالار بنا دیا تھا۔ جس نے بعد میں عادل شاہی حکومت قائم کی۔ بعد میں باہر سے آئے ہوئے لوگوں کو آفاقی کہا جانے لگا۔ جب آفاقیوں اور دکنیوں میں پر تشدد جھگڑے شروع ہوئے تو اس جھگڑوں میں محمود گاواں کو قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد محمد شاہ لشکری کا انتقال

ہوا۔محمد شاہ بہمنی سلاطین کا آخری عظیم الشان بادشاہ تھا۔محمد شاہ کے حکومت میں اردو کی قدیم ترین مثنوی' کدم راؤ پدم راؤ" لکھی گئی۔محمد شاہ کے جانشنیوں میں محمود شاہ، احمد شاہ، رابع، علاء الدین ولی اللہ اور کلیم اللہ کا زمانہ بڑا ہی پر آشوب رہا ہے۔محمود شاہ نے گو چھبیس سال تک حکومت کی لیکن آپسی نا چاتی اور دکنیوں اور آفاقیوں کے جھگڑوں نے سلطنت کی چول چول ڈھیلی کردی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہمنی دور کے صوبے داروں نے ایک کے بعد ایک خود مختاری کا اعلان کردیا اور بہمنی سطنت پانچ سلطنتوں میں بٹ گئی۔اور یہ عظیم سلطنت ۱۳۵۰ء میں قائم ہوئی تھی ۔۱۵۲۵ء میں ختم ہوگئی۔

3.3 بہمنی دور کے علمی اورادبی کارنامے:

اب تک کی تحقیق کے مطابق دکنی اردو کی قدیم ترین مثنوی' کدم راؤ پدم راؤ" ہے۔ایک زمانے تک معراج العاشقین کو اردو کی پہلی تصنیف سمجھا جاتا تھا۔اور یہ خواجہ بندنواز گیسودراز سے منسوب کی جاتی تھی۔لیکن ڈاکٹر حفیظ قتیل نے "معراج العاشقین "مصنف کے عنوان سے جو کتاب لکھی ہے اسمیں مدلل انداز میں انہوں نے ثابت کردیا ہے کہ "معراج العاشقین " نہ تو حضرت گیسودراز کی تصنیف ہے نہ ان زمانے میں لکھی گئی ہے۔ بلکہ ان کے زمانے کے وہ تقریباً دوسوسال بعد مخدوم شاہ حسینی نے اس کو لکھا ہے۔اور اسی طرح "معراج العاشقین " کو اردوے قدیم یا دکنی کی پہلی تصنیف نہیں کہا جاسکتا۔

مذکورہ تحقیق کے بعد فخر دین نظامی کی مثنوی " کدم راؤ پدم راؤ" اردو کی قدیم ترین تصنیف قرار پائی ہے۔ یہ مثنوی احمد شاہ ولی بہمنی کے عہد میں لکھی گئی ہے۔احمد شاہ کا زمانہ ۸۲۵ء تا ۸۳۸ء ھ م ۱۴۲۱ء تا ۱۴۳۴ء رہا ہے۔احمد شاہ کے دور کی تصنیف ہونے کی داخلی شہادت خود مثنوی میں موجود ہے۔نظامی نے لکھا ہے

شہنشہ بڑا شاہ احمد کنوار　　پرت پال سنیسار، کردار ادھار
دھنیں تاج کو کونراجا بھیگ　　کنور شاہ کا شاہ احمد بھیجگ

مثنوی میں بار بار مصنف نے اپنا نام "فخر وین نظامی" لکھا ہے۔ مثنوی کا نام کیا تھا اس کا پتا نہیں چلتا کیوں کہ ابتدائی ورق اور بیچ کے کئی اوراق کے علاوہ آخر کا حصہ بھی اس مثنوی کا نہیں ملتا۔ چونکہ مثنوی کی کہانی کدم راؤ اور پدم راؤ کے کرداروں پر استوار ہوتی ہے۔ اس لئے مثنوی کے متعلق ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس مثنوی کا نام کدم راؤ پدم راؤ رکھ دیا ہے اور اسی نام سے یہ شائع بھی ہوئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کا قصہ کسی مشہور ہندوستانی کہانی سے ماخوذ ہے۔ اس مثنوی کی کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ کدم راؤ راجہ ہے اور اس کا وذیر پدم راؤ ہے۔ کدم راؤ ایک دن اعلی ذات کی ناگنی کو ایک کم ذات کے سانپ کے ساتھ میل کھاتا دیکھ لیتا ہے۔ وہ کم ذات کے سانپ کو فوراً ہی تہہ تیغ کر دیتا ہے اور ناگنی کو بھی مارتا ہے، لیکن اس کی دم کٹ جاتی ہے اور وہ جھاڑیوں میں چھپ جاتی ہے۔ راجہ کدم راؤ کو عورت کے بے وفائی کا یقین ہو جاتا ہے اور وہ اداس رہنے لگتا ہے۔ رانی سمجھانے کی کوشش کرتی ہے کہ پانچوں انگلیاں یکساں نہیں ہوتیں اور سنیاسیوں کی صحبت میں رہنے لگتا ہے، وہ اکھر ناتھ قامی جوگی سے بے حد متاثر ہوتا ہے، کیونکہ وہ کسی بھی چیز کو کسی بھی دوسری چیز میں تبدیل کرنے کا گر جانتا تھا۔ وہ اپنے اس کمال سے راجہ کو چڑیا بنا دیتا ہے۔ اور خود راجہ بن بیٹھتا ہے۔ ایک دن وہ پدم راؤ سے ایک فرمائش نامعقول کرتا ہے۔ جب پدم راؤ اسے پورا کرنے سے انکار کر دیتا ہے اس پر بہت برہم ہوتا ہے۔ ادھر کدم راؤ چڑیا کہ روپ میں اڑتے اڑتے اپنے محل پہنچتا ہے، اور اس سے کہتا ہے کہ اصل وہی کدم راؤ ہے۔ پچھلی باتیں جب وہ سناتا ہے تو پدم راؤ کو یقین ہو جاتا ہے کہ وہی کدم راؤ راجہ ہے۔ پدم راؤ موقع پا کر جب اکھر ناتھ گہری نیند میں رہتا ہے اسے ختم کر دیتا ہے۔ کدم راؤ منتر کے زور سے پھر اپنی اصلی حالت میں آجاتا ہے اور محل میں واپس آکر ہنسی خوشی زندگی بسر کرتے ہیں۔

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کی زبان بے حد مشکل ہے اور اس کو سمجھنا بھی بہت مشکل ہے۔ اس مثنوی کی قدامت کے باوجود اس میں جو خوبیاں ملتی ہیں اس کے تعلق سے جمیل جالبی لکھتے ہیں:

" مثنوی کدم راؤ پدم راؤ ساڑھے پانچ سو سال سے زیادہ پرانی مثنوی ہے، اور اردو ادب کی اولین روایت کی نمائندہ ہے۔ جس کثرت سے اس میں ضرب الامثال اور محاورے استعمال ہوتے ہیں۔ وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ زبان مدتوں پرانی ہے۔ جو سینکڑوں سال کی مسافت طے کر کے، اپنے ارتقاء کے مختلف منزلوں سے گذر کر ادبی سطح پر استعمال میں آنے کے لائق بنی ہے۔ سنسکرتی الفاظ کے استعمال کے علاوہ جہاں تک بیان کی چستی اور رچاوٹ کا تعلق ہے وہ کدم راہو پدم راؤ میں موجود ہے۔ جہاں بیان میں بیجا پھیلاؤ کا بھی احساس نہیں ہوتا بلکہ بات کو اختصار کے ساتھ بیان کرنے کا عمل ملتا ہے۔ مثنوی میں استعمال ہونے والی ضرب الامثال میں سے شاید ہی کوئی ایسی ہے جو آج بھی اردو زبان کے سرمائے میں شامل نہ ہو" (تاریخ ادب اردو ۱۶۶)

میراں جی شمس العشاق:

میران جی عین جوانی میں دبیاوی تعلقات ترک کر کے راہ خدا میں نکل گئے تھے۔ وہ بیت اللہ میں قیام کے بعد مدینہ منورہ میں کوئی بارہ سال رہے۔ وہ ایسے خاندان کے بانی تھے جس نے صدیوں تک دکن میں رشد و ہدایت کا کام انجام دیتے رہے۔ میراجی کا زمانہ ۱۴۹۶ء کا ہے۔ وہ یہ زمانہ تھا جب بہمنی سلطنت طوائف الملکی کا شکار ہو چکی تھی۔ وہ رد بہ زوال تھی ۱۴۹۰ء میں عادل شاہ حکومت اپنی آزادی اور خود مختاری کا اعلان کر چکی تھی۔ بیدر کی برید شاہی (۱۴۸۷) سلطنت بھی آزادی کا اعلان کر چکی تھی۔ برار میں عماد شاہی (۱۴۷۸)، حکومات بھی قائم ہو چکی تھی۔ احمد نگر کی نظام شاہی (۱۴۹۰) سلطنت بھی الگ ہوگئی تھی، قطب شاہی سلطنت نے البتہ (۱۵۱۲ء) خود مختاری کا اعلان کیا، ان حالات میں ہر طرف بے اطمینانی تھی۔ میراں جی کی تصانیف اس زمانے میں سامنے آئیں اور اللہ کی طرف رجوع ہو کر سکون پانے کا طریقہ بتاتے رہے۔ اسی وجہ سے ان کی تمام

تصانیف کا موضوع تصوف اور اخلاقی تعلیم ہے۔ان کی چار کتابیں ملتی ہیں (۱) خوش نامہ (۲) خوش نغز (۳) شہادت الحقیق (۴) مغز مرغوب۔

"خوش نامہ" ایک سوستر اشعار پر مشتمل نظم ہے۔اسمیں ایک نیک سیرت لڑکی کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ حد درجہ نیک لڑکی تھی۔اس کی بہترین صفات کی وجہ سے سب ہی اس سے محبت کرتے تھے،اور عزت بھی کرتے تھے۔لیکن وہ صرف سترہ سال کی ہوئی تھی کہ اللہ نے اس کو اپنے پاس بلالیا۔اتنی کم عمری میں خوش کا مرجانہ افسوس ناک بات ہے لیکن اللہ کی مرضی یہی تھی۔اس کی موت سے میراں جی اخلاقی نتائج اخذ کر کے روحانی مسائل کی تشریح کرتے ہیں۔

دوسری نظم "خوش نغز " ہے۔ ہ صرف بہتر (۷۲) اشعار پر مشتمل ہے۔اس میں سوال اور جواب طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔خوش، مختلف روحانی اور مذہبی مسائل پر سولات کرتی ہے اور میراں جی اس کا جواب دیتے ہیں جیسے عقل اور عشق، کرامات، مراقبہ، عرفان روح وغیرہ۔میراں جی کی نظموں میں مختلف بولیوں جیسے برج بھاشا، پنجابی اور سرائکی کے اثرات ملتے ہیں۔

"شہادت التحقیق" میراں جی کی ایک طویل نظم ہے جو پانچ سوتر سیٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔اس نظم میں شریعت اور طریقت کے مسائل قران اور حدیث کے ذریعے سمجھائے گئے ہیں۔اس میں بھی سوال اور جواب کا طریقہ اپنایا گیا ہے،"طالب" سوال کرتا ہے "مرشد" جواب دیتے ہیں۔اس میں بھی شریعت اور طریقت کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس میں یہ تلقین کی گئی ہے کہ سوچ سمجھ کر شریعت اور طریقت پر چلنا چاہیئے جو ایسا نہیں کرتے وہ اپنی عمر ضائع کرتے ہیں،

ہور پھوکٹ عمر کھودے

بے فہموں دیکھن آویں تو ایک بٹی ناویں

شمس العشاق کی جوتھی اور آخری نظم ہے اس میں بھی فلسفیانہ اور صوفیانہ مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

میراں جی کی زبان مشکل ہے۔اور اس کو سمجھنے میں دقت پیش آتی ہے۔اردو زبان کی خدمت

میراں جی اوران سے پہلے اور بعد کے ادیبوں نے جس طرح کی ہے۔اس کی وضاحت کرتے ہوئے جمیل جالبی لکھتے ہیں:

'یوں معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ کھودا جارہا ہے اور ہزار اور ہزار دشواریوں سے راستہ بنایا جارہا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی محنت اور صلاحیت سے زبان کے دریا کو بیان کے راستے پر ڈالا۔آج وہ مشکل، نامانوس اور بے معنی نظر آتے ہیں، اگر یہ لوگ اسی دور میں زبان و بیان کے نئے نئے تجربے (اور یہ سب حقیقت میں تجربے ہیں) نہ کرتے تو سرسوتی کی طرح اس زبان کا دریا بھی راستے ہی میں خشک ہوجاتا۔ یہ اردو زبان کے وہ نمونے ہیں جو نویں صدی ہجری کی زبان پر نہ صرف روشنی ڈالتے ہیں بلکہ نقوش راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ہم اس سرائے سے مختلف تہذیبی دھاروں اور اثرات کا مطالعہ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کس کس اثر نے ہماری فکر، ہمارے اظہار کو متاثر کیا ہے اور وہ کون سے اثرات تھے جو اٹھے، بڑھے اور غالب ہوگئے۔جس طرح کسی جہاز کی پرواز کو بہت دور تک دیکھنے کیلئے اسے مسلسل ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا پڑتا ہے، اسی طرح اردو کی روایت کو دور تک دیکھنے اور سمجھنے کے لئے ان لوگوں کے زبان و بیان کی پرواز کو بھی مسلسل دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے" (تاریخ ادب اردو ۱۷۴)

سید اشرف شاہ بیابانی:

سید شاہ اشرف بیابانی (۱۴۵۹ تا ۱۵۲۸ء) رفاعی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ان کی تین تصانیف ملتی ہیں۔ "لازم المبتدی" واحد باری، نوسر ہار، لازم المبتدی، ایک طویل نظم ہے جو ایک سو اٹھانوے اشعار پر مشتمل ہے، اس میں ایسے مسائل کو پیش کیا ہے، جن کی ضرورت اور روزمرہ کی زندگی میں عورتوں اور مردوں کو پیش آتے رہتے ہیں جیسے فرائض غسل، فرائض وضو، فرائض نماز، سجدہ سہو، بیان

روزمرہ، بیان عیدین وغیرہ۔ اشرف کی زبان میراں جی کی زبان کے مقابلہ میں زیادہ سہل ہے۔ حالانکہ وہ میراں جی کے ہم عمر ہم عصر ہیں۔ یہ نظم ایسی لکھی گئی ہے جو ہر وقت کام میں آئے۔ کیونکہ اس میں روزمرہ کے فرائض مذہبی کو جس کا واسطہ ہر شخص کو پڑتا ہے۔ بول چال کی زبان میں پیش کیئے گئے ہیں۔

لازم المبتدی اس کا نام پڑے جو ہر وقت آئے گا کام

وضو اور غسل کر کے نماز کے لئے تیار ہونے کو یوں بیان کیا ہے۔

پلیتی دور کر کپڑے سیں وضو کرنا پہل غسل میں

تین بار سر میں پانو لگ دھوناں بچھوں نماز پر طیار ہوناں

اسی طرح تمام احکام بیان کئے گئے ہیں؛

واحد باری کے نام سے نعتیں لکھی جاتی تھیں۔ یہ سلسلہ شاید امیر خسرو کے زمانے سے چلا جو مدتوں تک قائم رہا۔ امیر خسرو سے جو نعت منسوب کی جاتی ہے وہ خالق باری ہے۔ اس میں اردو الفاظ کے معنی فارسی میں دیئے گئے ہیں۔ واحد باری میں عربی، فارسی کے الفاظ کے معنی اردو میں دیئے گئے ہیں:

بحر ہے وریا آب براخ کلام موزوں بے ڈالی شاخ

نیم بیت کو حصرئے بول دو مصرع بیت ہے کھول

رباعی کیا؟ چو مصرع جان مخمس کیا؟ پنج مصرع خواں

لازم المبتدی اور واحد باری دونوں کی زبان آان اور بول چال کی زبان سے ترتیب ہے۔

نوسر ہار اشرف نے ۱۵۰۳ء میں لکھی۔ اس مثنوی کا نام نوسر ہار اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس میں نو باب ہیں اور ہر باب گویا ہیروں کا ہے۔ ادبی لحاظ سے بھی یہ مثنوی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اشرف نے فخریہ طور پر کہا ہے کہ اس مثنوی میں اس نے ہیرے موتی جڑے ہیں۔ انکو سونے کے تار میں پرویا ہے، ہر ہر مصرعے میں نگینے جڑے ہوئے ہیں س مثنوی کے نو باب نہیں ہیں بلکہ نوسر ہار ہیں جن کی قیمت ہزاروں اور لاکھوں ہے۔

سونے کی جیوں کھونٹی گھڑ　　ہیرے مانک موتی جڑ
ایک ایک بول تلک مول　　سیم تراز وسیں تھیں قول
ہندیرائی سونے تار　　سچیں ہووا، نوسر ہار
ہر ہر مصرے باندلڑ　　رتن بدارت مانت جڑ
اے نو باباں نوسر ہار　　قیمت اس کی لاکھ ہزار

مثنوی کا موضوع واقعہ کربلا یعنی شہادت حسین ہے جس کو ہندوی زبان میں لکھا گیا ہے

بازاں کیتا ہندوی میں　　قصہ نقل شاہ حسین

ہر باب کا عنوان فارسی میں ہے۔ یہ مثنوی شاید مجلسوں میں سنانے کے لئے لکھی گئی ہے اس کی زبان بہت با محاورہ ہے۔ جو محاورے اس مثنوی میں ملتے ہوئے وہ آج بھی ہماری زبان کا جز و ہیں جیسے وقت آنا (موت آنا) اٹھا جان (مرجان)، غم کھانا (فکر و تردود میں مبتلا رہا)، ہات آتا حاصل ہونا، ہات ملنا (افسوس کرنا)، پھل پانا (اچھا نتیجہ حاصل ہونا)، آسمان ٹوٹ پڑنا (سخت مصیبت پڑنا)، قول کرنا (وعدہ کرنا) وغیرہ۔ اشرف کی اس مثنوی میں رزمیہ انداز بھی ملتا ہے، میدان جنگ کا نقشہ بھی اس نے اچھی طرح کھینچا ہے۔ اسی طرح جذبات اور احساس کی پیش کش بھی بہت اچھی ہے۔ یہ مثنوی اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ جب اردو زبان ابتدائی شکل میں تھی اس زبان کو اردو ہی نہیں بلکہ دکنی کے نام سے بھی ابھی پکارا نہیں گیا تھا۔ جمیل جالبی کے کہنے کے مطابق؛

"میراں جی کی طرح اشرف بھی اپنی زبان کو ہندوی کہتا ہے، شاہ باجن بھی اپنی زبان کو ہندی یا دہلوی کہتے ہیں، ابھی اس کے لئے گجری یا دکنی لفظ استعمال نہیں ہوا" (تاریخ ادب اردو ۱۷۴)

بہمنی دور نے اردو کی سب بڑی خدمت کی کہ اس زبان کو دکن کے چپے چپے تک پہنچا دیا۔ بہمنی سلطنت ایک عظیم سلطنت تھی جب یہ ٹوٹی تو پانچ بڑی بڑی سلطنتیں وجود میں آئیں۔ بہمنیوں نے

ایک مشترکہ زبان اور ایک مشترکہ تہذیب آنے والوں کو دی۔ جس سے وہ اپنی الگ شناخت اور پہچان بنا سکے۔ بہمنی دور ہی میں زبان و بیان کو اتنا نکھارا اور سنوارا گیا تھا کہ وہ ادبی اغراض کے لئے استعمال ہو سکے اور اس میں ہر قسم کے موضوعات بیان ہو سکیں۔ بہمنی دور کے مصنفین نے اردو زبان کی خدمت جس طرح کی اس پر یوں روشنی ڈالتے ہیں؛

"یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی صلاحیتوں کو اردو زبان کے مزاج و خون میں شامل کر کے اسے آگے بڑھایا، اگر یہ لوگ ایسا نہ کرتے اور اس زبان کو اپنے اپنے انداز میں اپنی اپنی ضرورت کے مطابق استعمال نہ کرتے تو یہ زبان وقت کی قبر میں کبھی کی دفن ہو چکی ہوتی۔ طویل نظم لکھنا، اور وہ بھی ایسے دور میں جب خود زبان و بیان کی طرح ہر سطح پر گھٹنوں چل رہی تھی، کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ان لوگوں نے زبان کو مختلف موضوعات سے آشنا کر کے اسے جلد ہی کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ قدیم اردو مصنفیں کا ہم پر یہی احسان ہے۔" (تاریخ ادب اردو جلد ۵، ۱۷۹)

بہمنی عہد جب ختم ہوا تو پانچ سلطنتوں میں بٹ گیا۔ لیکن بہمنی دور نے ایسی مضبوط لسانی اور تہذیب روایت قائم کی تھی جس پر یہ تمام ریاستیں تادم آخر چلتی رہیں۔ ان میں سے عادل شاہی اور قطب شاہی دور ادبی لحاظ سے بھی پر شکوہ اور شاندار رہا ہے جس پر اردو زبان و ادب جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ یہ اردو ادب اور تہذیب کا بھی سنہری دور ہے۔

3.4 نمونہ امتحانی سوالات

۱۔ وہ کون سے سیاسی اور تاریخی حالات تھے جن کی وجہ سے اردو شمال سے دکن آئی؟

۲۔ ارو کے علاوہ اردو زبان کے اور کون سے نام ملتے ہیں اور یہ نام کیوں کر اسے اسے ملے، تفصیلی طور پر لکھئے۔

۳۔ بہمنی بادشاہوں کے عہد میں علم وادب کی جو سرپرستی ہوئی، اس پر روشنی ڈالئے۔

۴۔ نظامی کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں بیان کیجئے۔

۵۔ میراں جی شمس العشاق کی تصانیف کا جائزہ لیجئے۔

۶۔ نوسرہار کے علاوہ سید شاہ اشرف بیابانی کی جو تصانیف ملتی ہیں ان کا تفصیلی طور پر جائزہ لیجئے۔

۷۔ نوسرہار کا تنقیدی جائزہ لیجئے۔

3.5 خلاصہ:

اردو شمالی ہند میں پیدا ہوئی۔ لیکن دکن میں وہ نہ صرف پلی بڑھی بلکہ ادبی اغراض کے لئے استعمال ہونے لگی۔ شمال سے دکن وہ سیاسی وجوہات کی بنا پر پہنچی۔ امیر خسرو نے اسے ہندی یا ہندوی کہا۔ دہلی میں وہ "زبان دہلوی" کہلائی۔ علاء الدین خلجی نے دکن کا پورا علاقہ فتح کرلیا۔ جس میں گجرات اور مالوہ بھی شامل تھے۔ اس پورے علاقے کو اس نے سو موضعات میں تقسیم کردیا۔ اور ہر حصہ پر اپنا ایک امیر یا حاکم مقرر کیا جس کو "امیرِ صدہ" کہا گیا، امیرانِ صدہ نے دکن ہی کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ وہ اپنے تمام متعلقین کے ساتھ دکن آئے۔ امیرانِ صدہ کے نظام کو بعد میں تغلق نے بھی قائم رکھا۔ بعض نے جب پائے تخت دہلی کی بجائے دولت آباد منتقل کیا تو دہلی کی ساری آبادی دکن منتقل ہوگئی۔ لیکن جب دوبارہ دہلی کو پائے تخت بنایا گیا تو بے شمار لوگ دکن ہی میں رہ گئے۔ اردو پہلے گجرات، پہنچی، اور گجری کہلائی، اور بعد میں دکن پہنچی تو دکنی کہلائی۔ مذکورہ بالا سیاسی حالات کی وجہ سے اردو کو دکن میں پھلنے پھولنے کا موقع مل گیا۔ بعد میں جب تغلق کی حکومت کمزور پڑ گئی تو امیرانِ صدہ نے متحدہ طور پر بغاوت کردی۔ اور اپنی آزادی کا اعلان کردیا۔ اس نئی سلطنت کا بانی علاء الدین شاہ بہمنی تھا۔ اسی مناسبت سے ۱۳۴۷ء میں عظیم الشان بہمنی سلطنت قائم ہوئی۔ چونکہ ہر سلطنت جب آزاد ہوئی ہے تو ہر بات میں اپنی شناخت بناتی ہے اسی طرح بہمنی سلطنت نے بھی ہر بات میں

شمالی ہند سے الگ طور پر اپنی شناخت قائم کی۔ لسانی طور پر بھی چونکہ شمالی ہند میں فارسی کا بول بالا تھا اس لئے اور ہر اس وجہ سے بھی کہ ان کے رابطے کی زبان شروع ہی سے اردو تھی اس لئے انہوں نے اردو ہی کو اپنایا۔ اور ہر ممکن طرح سے اردو کی سرپرستی کی بڑی مدت تک اردو کو اردو نہیں کہا گیا۔ وہ ہندی اور ہندوی کہلاتی تھی۔ بعد میں دکنی کہلائی۔

اردو کی ترویج و اشاعت میں صوفیائے کرام کا بھی بڑا حصہ رہا ہے۔ دکن میں بھی کئی صوفیا آئے اور جنہوں نے یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی انہوں نے فارسی کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی رشد و ہدایت کے لئے استعمال کیا۔ بہمنی سلاطین بھی ان صوفیا کا بڑا احترام کرتے تھے۔ یہ بزرگان دین عوام ہی کی رہنمائی نہیں کرتے تھے، بلکہ خود بادشاہوں کو بھی راہ راست پر لاتے تھے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری نے لکھا ہے کہ حضرت زین الدین نے محمد شاہ بہمنی کو تلقین کی کہ وہ مے نوشی ترک کر دے تو اس نے نہ صرف خود شراب پینا چھوڑ دیا بلکہ حدود سلطنت میں مے نوشی ممنوع قرار دے دی۔ فیروز شاہ بہمنی کے عہد میں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز بھی دکن تشریف لائے۔ ان بزرگانِ دین کی وجہ سے بھی دکنی اردو کی ترویج ہوئی وہ فارسی کے ساتھ اردو میں بھی رشد و ہدایت کا کام انجام دیا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ دکنی میں ہی تصنیف و تالیف بھی کیا کرتے تھے۔ بہمنی عہد کوئی دو سو سال تک چلتا رہا۔ اس پورے دور میں دکنی اردو ہی رابطے کی زبان تھی اور علمی ادبی اور مذہبی اغراض کے لئے دکنی ہی استعمال کی جاتی تھی۔ اس کے برخلاف شمالی ہند میں ہر سطح پر فارسی ہی کا بول بالا رہا۔ حد یہ کہ اردو کے شاعر جب اردو ہی کے شاروں کا تذکرہ لکھتے ہیں تو فارسی میں لکھتے ہیں۔ کیونکہ ان کے لئے اردو صرف بول چال کی زبان تھی۔ وہ اردو کی اس سطح کو بلند نہیں کر پا رہے تھے۔ لیکن دکنی ادیبوں اور شاعروں نے ہر قسم کے علمی اور ادبی کاموں کے لئے اردو کو استعمال کیا۔ اور یہ کام سب سے پہلے بہمنی دور میں ہوا۔ بہمنی دور نے دکنی اردو کو ایسی مضبوط بنیادیں فراہم کر دی تھیں جس پر بعض کی ریاستیں خاص طور پر عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتیں دکنی ادب کی عالی شان اور پائیدار عمارتیں بنا سکے۔ ۱۵۲۵ء میں جب عظیم الشان بہمنی سلطنت ختم ہوئی اور پانچ سلطنتیں قائم ہوئیں تو ان سب میں دکنی کو

پھلنے پھولنے اور ممکنہ ترقی پانے کا موقو ملا۔

بہمنی سلطنت میں دکنی زبان کو علمی اور ادبی اغراض کے لئے جس کمال کے ساتھ استعمال کیا وہ بہمنی ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات میں پوری شان اور آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہے۔ دکنی کی موجودہ تحقیق کی بنا پر قدیم ترین شاعر فخر دین نظامی ہے۔ اس مثنوی کا صرف ایک ہی نسخہ ساری دنیا میں ملتا ہے۔ یہ نسخہ بھی بہت ہی خستہ حالت میں ہے۔ اس کا ابتدائی حصہ بھی چونکہ تلف ہو گیا ہے اس لئے مثنوی کا نام کیا تھا یہ معلوم نہیں ہوتا۔ مثنوی کے دو اہم کردار کدم راؤ اور پدم راؤ ہیں۔ اسی وجہ سے مثنوی کے مرتب ڈاکٹر جمیل جالبی نے اسے مثنوی " کدم راؤ پدم راؤ" کا نام دیا ہے۔ اس مثنوی کی زبان کو سمجھنا بے حد مشکل ہے۔ اس مثنوی میں کسی مشہور اور مقبول ہندوستانی قصہ کو پیش کیا گیا ہے۔ اس زمانے میں جب کہ زبان ابتدائی حالت میں بھی اتنی طویل مثنوی لکھنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ادبی اغراض کے لئے بھی یہ زبان کافی مدت سے استعمال ہو رہی تھی، دوسری بات یہ کہ اس مثنوی کا لکھنے والا قادر الکلام شاعر تھا۔ اس نے جو محاورے استعمال کئے ہیں ان سے بھی یہ بات ظاہر ہوتی ہے ۔ بہر حال یہ مثنوی دکنی ادب کا قدیم ترین اور قابل قدر نمونہ ہے۔

میراں جی شمس العشاق اس عہد کے ایک اہم شاعر اور بزرگ ہیں۔ ان کی چار کتابیں ملتی ہیں، (۱) خوش نامہ (۲) خوشی نفز (۳) شہادت التحقیق (۴) مقزغوب۔

خوش نامے میں ایک ۱۷ سالہ لڑکی کی جو حد درجہ نیک اور پاکیزہ صفات رکھتی تھی۔ اس نوعمری میں وہ اللہ کو پیاری ہو جاتی ہے۔ اس کی موت سے میراں جی نے اخلاقی نتائج اخذ کیئے ہیں اور روحانی مسائل کی تشریح کی ہے۔

دوسری نظم "خوش نغز" سے یہ ۲۷ اشعار والی مختصر نظم، سوال اور جواب کی صورت میں لکھی گئی ہے۔ اس نظم کا مرکزی کردار خوش ہے وہ میراں جی سے روحانی مسائل کے بارے میں سولات کرتی ہے اور میراں جی اس کا جواب دیتے ہیں۔ تیسری نظم "شہادت التحقیق" ہے۔ یہ ایک طویل نظم ہے جو پانچ سو ترسٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں شریعت اور طریقت کے مسائل قرآن شریف اور احادیث

کی روشنی میں پیش کئے گئے ہیں اس میں بھی سوال و جواب کا طریقہ اپنایا گیا ہے۔ طالب سوال کرتا ہے اور مرشد جواب دیتے ہیں۔ سوال بھی تفصیلی ہیں اور جواب بھی۔ میران جی کی ایک اور مختصر نظم "مغز مرغوب" ہے۔ اس میں صوفیانہ اور فلسفیانہ مسائل کی تشریح کی گئی ہے۔ میران جی کی زبان قدیم ہونے کی وجہ سے بہت مشکل معلوم ہوتی ہے۔

سید شاہ اشرف بیابانی، میراں جی شمس العشاق کے کم عمر ہم عصر ہیں ان کی تین تصانیف ملتی ہیں: (۱) لازم المبتدی (۲) واحد باری (۳) نوسر ہار، لازم المبتدی ایک طویل مثنوی ہے، جو ایک سو اٹھانوے اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں ایسے مذہبی مسائل کو پیش کیا گیا ہے جس کی ضرورت مردوں اور عورتوں کو روزمرہ زندگی میں پیش آتی ہے۔ جیسے فرائض وضو، فرائض غسل، فرائض نماز، بیان وغیرہ اس طرح تمام مذہبی احکام کا احاطہ اس مثنوی میں کیا گیا ہے۔

اشرف نے "واحد باری" کے عنوان سے ایک نعت لکھی ہے۔ امیر خسرو کے زمانے میں ایسی نعتیں لکھی جاتی ہیں۔ امیر خسرو نے جو "خالق باری" کے عنوان سے نعت لکھی تھی اس میں اردو الفاظ کے معنی فارسی اور عربی میں دیئے تھے، واحد باری میں عربی اور فارسی کے الفاظ اردو میں دیئے گئے ہیں۔

اشرف کی سب سے اہم تصنیف نوسر ہار ہے۔ اس میں واقع کربلا یعنی شہادت حضرت امام حسین کو پیش کیا گیا ہے۔ چونکہ مثنوی کے نو باب ہیں، اس لئے اسے نوسر ہار کہا گیا ہے۔ اس کی زبان بامحاورہ ہے۔ اس میں رزم کی کیفیت کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ جذبات و احساسات کی عکاسی بھی اچھی کی گئی ہے۔ ان تمام خوبیوں کی وجہ سے ادبی لحاظ سے بھی یہ مثنوی اچھی ہے۔

اشرف کے ساتھ بہمنی دور ختم ہو جاتا ہے۔ بہمنی دور اردو ادب کی تاریخ میں اس لئے اہمیت رکھتا ہے کہ اسی عہد میں دکنی زبان و ادب کو ایسی مستحکم بنیادیں فراہم کر دی تھیں جس کی وجہ سے بعد میں بھی ان بنیادوں پر اردو شعر و ادب کی شاندار عمارتیں کھڑی کی گئیں۔

3.6 فرہنگ:

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
اردو	لشکر، چھاؤنی، بازار	اردوئے معلیٰ	شاہی لشکر، اعلیٰ اردو
رشد	راہ راستی کی تعلیم، ہدایت		
ریختہ	ریختن کے معنی ٹپکانا، ملنا اردو کو ریختہ اسلئے کہا گیا ہے کہ دوسری زبانوں کے الفاظ اس میں ملے ہوئے ہوتے ہیں۔		
رزم	جنگ وجدل، رزمیہ ایسی ثانوی ہے جس میں جنگ وجدل کے حالات وواقعات ہوتے ہیں۔		
شریعت	اسلامی اصول وقوانین		
طریقت	باطنی طور پر نیکی کے اصولوں کو اپنانا، بے ریائی کے ساتھ نیک عمل اور اصولوں پر کاربند رہنا		
مبتدی	شروع کرنے والا ابتدائی تعلیم حاصل کرنے والا		
ملفوظات	کہے ہوئے الفاظ، بولی ہوئی بات،		
قمار بازی	جوا کھیلنا	پلیتی	گندگی

3.7 سفارشی کتب

۱۔اردو کی ادبی تاریخ	پروفیسر عبدالقادر سروری
۲۔داستانِ ادب اردو	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۳۔مقدمہ تاریخ زبان اردو	ڈاکٹر مسعود حسین خان
۴۔تاریخ ادب اردو (جلد اول)	ڈاکٹر جمیل جالبی

دکنی شعروادب کا آخری دور: عہد ولی وسراج

ساخت:

4.0 اغراض ومقاصد

4.1 تمہید

4.2 دکنی شعروادب کا آخری دور: عہد ولی اور سراج

4.3 نمونہ امتحانی سوالات

4.4 خلاصہ

4.5 فرہنگ

4.6 سفارشی کتب

4.0 اغراض ومقاصد:

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ حسب ذیل باتوں سے واقف ہوں گے

☆ عہد ولی اور سراج کو دنی شعروادب کا آخری دور کیوں کہا گیا ہے

☆ ولی کو اردو شاعری میں اور خاص طور پر اردو غزل کی تاریخ میں کیا اور کیوں اہمیت ہے

☆ ولی کے عہد کے اہم شاعر کون کون سے ہیں؟

☆ سراج اور نگ آبادی اردو غزل گوئی میں کیا اہمیت رکھتے ہیں۔

4.1 تمہید:

مغلیہ سلطنت نے جب دکن فتح کیا تو جنوبی ہند کی سلطنتیں ختم ہوگئیں اور اس کے ساتھ دکنی

ادب کا درخشندہ اور تابندہ دور بھی ختم ہو گیا۔ بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت ۱۶۵۵ء میں تسخیر کر لی گئی اور گول کنڈہ کی قطب شاہی سلطنت ۱۶۷۶ء میں فتح ہوئی۔ جب شمال سے لے کر جنوب تک مغلیہ سلطنت پھیل گئی تو اس کے ساتھ تہذیبی اور معاشرتی تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ ان تبدیلیوں کے نتیجے میں لازمی طور پر لسانی تبدیلیاں بھی ہوتی ہیں۔ دکنی شعر و ادب کا وہ قلعہ جو قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں نے تعمیر کیا تھا اب مسمار ہونے لگا۔ شمال ہند کی وہ اردو جسے ریختہ کہا جاتا تھا۔ وہ دکنی زبان کو زیر نگیں کرنے لگی۔ اور باقر آگاہ کے الفاظ میں "طرز روزمرہ دکنی نہج محاورہ ءہند" سے تبدیل ہونے لگے۔ ولی دکنی اس لسانی آمیزش کے وہ سب سے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے آنے والے شعراء کے لئے ہر ممکن راستہ کھول دیا۔ خاص طور پر اردو غزل کو وہ مقام عطا کیا کہ وہ "اردو" شاعری کی آبرہ بن گئی۔ ولؔی نے اپنے بعد کے آنے والے ہر شاعر کو متاثر کیا خواہ وہ میرؔ ہوں کے سوداؔ، دردؔ ہوں کے مصحفیؔ، ناسخؔ، ہوں کہ آتشؔ ان میں سے کوئی شاعر ایسا نہیں جو ولؔی سے متاثر نہ ہوا ہو۔ اردو غزل کے ہر رنگ اور انداز کے موجد ولؔی ہیں۔

ولؔی کے ہم عصر اور ان کے فوری بعد کے شاعروں میں سید محمد فراقؔی، واؤدار نگ آبادی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن ولؔی کے بعد جو سب سے بڑا اور اہم نام ملتا ہے وہ سراج اورنگ آبادی ہے۔ ولؔی کی طرح سراؔج بھی آنے والے شاعروں کے لئے راہ نما اور رہبر کا درجہ رکھتے ہیں۔

4.2 دکنی شعر و ادب کا آخری دور: عہد ولؔی اور سراؔج

عادل شاہی اور قطب شاہی عہد دکنی شاعری کا زریں دور تھا، جب مغلیہ سلطنت نے عادل شاہی اور قطب شاہی حکومتوں کو ختم کر دیا تو اس کے ساتھ دکنی شعر و ادب کا زرین دور بھی ختم ہو گیا۔ اسی زمانے میں لسانی تبدیلیاں بھی زبردست پیمانے پر ہونے لگیں۔ جس طرح علاؤالدین خلجی اور محمد

تغلق کے سیاسی اقدامات نے دکن میں اردو کو رائج کر دیا، بالکل اُسی طرح اب مغلیہ سلطنت کے دکن پر تسلط نے "ریختہ" کو رواج دینے میں بڑا حصہ ادا کیا۔ باقر آگاہ نے اپنی مثنوی "گلزارِ عشق" کے دیباچے میں زبان کی اس تبدیلی کے تعلق سے لکھا ہے:

"جب تک ریاست سلاطین دکن کی قائم تھی زبان اور انکے درمیانے اون کے خوب رائج اور طعن وشماتت سے سالم تھی۔ اکثر شعرا کے مثل نشاطی وفراقی وشوقی وخوشنود و غواصی وذوقی وہاشمی وشعلی وبحری ونصرتی ومہتاب وغیرہ ہم کے بے حساب ہیں۔ اپنی زبان میں قصائد وغزلیات ومثنویاں قطعات نظم کیئے اور دادِ سخن وری کا دیتے۔۔۔
جب شاہانِ ہند اس گل زمینِ جنت نظیر کو تسخیر کیے، طرز روزمرہ دکنی نہج محارہء ہند سے تبدیل پائے۔ تا کہ رفتہ رفتہ اس بات سے لوگوں کو شرم آنے لگی، دور ہندوستان میں مدت لگ زبان ہندی کہ اسے برج بھاکا کہتے ہیں، رواج رکھتی تھی، اگرچہ لغت سنسکرت اصل اصول ادا فخزنِ قتوں روغ واصل ہے، پیچھے محاورہء برج میں الفاظ عربی اور فارسی بتدریج داخل ہونے لگے اور اسلوب خالص کو اوس کے کھونے لگے جب سے اس آمیزش کے یہ زبان "ریختہ" مسمیٰ ہوئی"

ریختہ کا لفظ ریختیں سے نکلا ہے جس کے معنی ٹپکنا، ملانا کے ہیں۔ ریختہ کے معنی ملایا ہوا شامل کیا ہوا یعنی حسب میں آمیزش ہو جیسا کہ باقر آگاہ نے لکھا ہے جب "ہندی" یعنی ہند کی زبان میں جب عربی اور فارسی الفاظ کی آمیزش ہوتی تو وہ زبان "ریختہ" کہلائی۔ ولؔی کی شاعری ریختہ اور دکنی زبانوں کے ملاپ کی بہترین اور روشن مثال ہے۔ قدیم اور جدید اردو کے سنگم کا بہترین نمونہ ہے۔

ولؔی کو قدیم اور جدید اردو کا سنگم کہنے سے یہ بھی مراد ہے کہ ولؔی جنوب اور شمال کی شاعری کا وہ "ریختہ" ہے جو آنے والی نسلوں کے لئے نیاز نور بن گیا ہے۔ اردو کا ہر تغزل گو شاعر اس نیازِ نور سے روشنی حاصل کر کے اپنی راہ پاتا ہے اور اپنی منزل پر پہنچتا ہے، وہ اردو کے اتنے عظیم شاعر ہونے کے

باوجود ان کی زندگی کے حالات جیسا کہ چاہیئے نہیں ملتے۔

ولؔی دکنی کے نام کے بارے میں اختلاف ملتا ہے، ان کا نام کسی نے "محمد ولی" لکھا ہے تو بعض ان کا نام "ولؔی محمد" ثابت ہوتا ہے۔ ولؔی کے وطن کے بارے میں بھی بڑی بحث ملتی ہے وہ گجرات کے تھے، اورنگ آباد کے تھے، لیکن خود ولؔی اپنے آپ کو جگہ جگہ دکھن کا شاعر کہا ہے۔ سنہ پیدائش کی طرح ان کے سنہ وفات کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔ البتہ مختلف شواہد سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ولؔی کا انتقال ۱۷۳۰ء اور ۱۷۲۵ء کے درمیان ہوا۔ ولؔی نے ۱۷۰۰ء میں دہلی کا دورہ کیا تھا۔ پھر اس کے بعد ان کا دیوان دہلی پہنچا۔ ان باتوں نے اردو غزل گوئی پر بڑے ہی دور اس اثرات مرتب کیے۔ جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

ولؔی اردو زبان کے بہت بڑے شاعر ہیں، محمد حسین آزاد نے ولؔی کو "اردو شاعری کا باوا آدم" کہا تھا۔ جس کی بعد میں تردید ہوئی۔ اردو شاعری کی ابتداء کے تعلق سے جب تحقیق ہوئی تو اردو شاعری کی تاریخ میں تین سو سال کا اضافہ ہوا۔ جس کی تفصیل پچھلے اوراق میں پیش کی جا چکی ہے۔ محمد حسین آزاد ولی کو اردو شاعری کا باوا آدم کہنے کے بجائے اگر "اردو غزل کا باوا آدم" کہیں تو آج ان کی بات کی تردید میں جتنے بھی دلائل پیش کئے جا رہے ہیں، اس کے برخلاف اس بات کی تائید میں اس سے زیادہ دلائل پیش کئے جا سکتے تھے۔ ولؔی ہر لحاظ سے اردو غزل کے باوا آدم ہیں، کیونکہ ان سے پہلے اردو کا کوئی بھی ایسا غزل گو شاعر نہیں تھا، جو اردو غزل پر اس قدر سایہ فگن ہو۔ ولؔی نے اردو غزل کا دائرہ اتنا وسیع اور ہمہ گیر کر دیا تھا کہ آج تک کوئی بھی شاعر اس احاطہ اثر سے باہر نہیں جا سکا ہے۔ یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ آج اردو غزل کو جو ترقی اور فروغ حاصل ہوا وہ کبھی حاصل نہ ہو سکتا اگر ولؔی کا کلام دہلی نہ پہنچتا، ولی کی وجہ سے اردو غزل کو اس کا سنہری دور حاصل ہوا۔ ان ہی کے کلام نے اردو شاعروں کو فارسی کے سحر سے آزادی دلائی، اور وہ اردو غزل میں جادو جگانے

لگے، ولی کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ انہوں نے اردو غزل کے سارے امکانات روز روشن کی طرح نمایاں کر دیا۔ انہوں نے عملی طور پر اردو غزل کے اتنے اور ایسے اعلیٰ نمونے پیش کئے کہ اردو کے ہر شخص کو یہ معلوم ہو سکا کہ اردو میں بھی اس قدر اعلیٰ اور ارفع غزل کہی جا سکتی ہے۔ صرف اردو کے شاعر ہی نہیں بیدلؔ جیسا فارسی کا غزل گو شاعر ولیؔ سے اتنا متاثر ہوتا ہے کہ اردو میں بھی غزل کہنے لگتا ہے۔ قائم چاندپوری نے لکھا ہے:

"ولی کے دیوان کی ہر بیت مطلع آفتاب سے زیادہ روشن ہوگئی وہ ریختہ کو اس قسم کی فصاحت و بلاغت کے ساتھ کہتا تھا کہ اس وقت کے اکثر اساتذہ از راہ ہوش ریختہ موزوں کرنے لگے تھے۔ چنانچہ قدرۂ السالکین و زبدۃ العارفین مرزا عبدالقادر بیدلؔ نے بھی ایک غزل اس زبان میں کہی ہے جس کا مطلع و مقطع یہ ہے:

مت پوچھ دل کی باتیں یہ دل کہاں ہے ہم میں ہم جنس بے نشان کا حامل کہاں ہے ہم میں
جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکار پردے سے ہار بولا بیدل کہاں ہے ہم میں

یہ بات بھی یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ اگر ولی کی غزل گوئی نہ ہوئی تو غزل اردو شاعری کی آبرو نہ بن پاتی۔ کیونکہ ولیؔ کی غزل کو دیکھ کر شمالی ہند کے شعراء کو اردو میں دیوان بنانے کا شوق پیدا ہوا۔ محمد حسین آزاد لکھتے ہیں؛

"غرض جب ان کا دیوان دلی پہنچتا تو اشتیاق نے ادب کے ہاتھوں پر لیا، قدردانی نے غور کی آنکھوں سے دیکھا، لذت نے زبان سے پڑھا، گیت موقوف ہوگئے، قوال موقفت کی محفلوں میں انہیں کی غزلیں گانے بجانے لگے، ارباب نشاط یاروں کو سنانے لگے، جو طبیعت موزوں رکھتے تھے، انہیں دیوان بنانے کا شوق ہوا"

اردو غزل میں میرؔ، سوداؔ، دردؔ، مصحفیؔ، ذوقؔ، ناسخؔ، اور آتشؔ کا رنگ تغزل ایک دوسرے سے

بہت الگ اور مختلف ہے لیکن یہ سب کے سب غزل گو شعراء ولی سے متاثر رہے ہیں ولی نے اس سے بہت پہلے ان سب کے لئے نمونے فراہم کر دیئے تھے۔ امداد امام اثر اپنی کتاب "کاشف الحقائق" میں لکھتے ہین:

"غزل گوئی کے اعتبار سے ولی اول درجے کے شاعر تھے، جو غزل گوئی کے تقاضے تھے ان سے ولی کو پوری طرح اطلاع تھی۔۔ اسلیئے ان کی غزل سرائی پر تاثیر نظر آتی ہے۔ ولی کے کلام میں درد، سودا، میر، مصحفی، ذوق، ناسخ، آتش سب کے رنگ بکثرت موجود ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی کس قدر قوی الدماغ شاعر تھے۔ جو ہر نوع کے کلام پر قدرت تامہ رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مابعد جتنے متغزلین موجد کسی طرز کے کہلاتے ہیں درحقیقت اسی پیر طریقت کے مرید ہیں۔"

ولی کی وجہ سے اردو شاعر اور خاص طور پر غزل کی طرف جس طرح اس زمانے کے شاعر متوجہ ہوئے۔ اس کے تعلق سے نورالحسن ہاشمی اپنی کتاب، "ولی کا دبستانِ شاعری" میں بتاتے ہیں کہ ولی سے پہلے بھی دکنی شعراء کی تخلیقات شمالی ہند پہنچتی تھیں۔ لیکن اس کی طرف بے التفاتی سے کام لیا جاتا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

"دکن سے یہ ادبی کاوشیں بطور سوغات شمالی ہند میں وقتاً فوقتاً ضرور پہنچتیں رہیں، لیکن دہلی کے فارسی داں اسے صرف "اک بات لچرسی بہ زبان دکنی" سمجھتے رہے، اور چنداں لائق اعتبار نہ سمجھا۔ ہاں جب دکن اور گجرات میں ولی سا صاحب کمال پیدا ہوا اور اس نے ایسی زبان اپنے کلام میں استعمال کی جو دہلی میں بھی استعمال ہوتی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ صوفیانہ خیالات اسی لہجے پر پیش کیے جس طرح فارسی میں پیش ہوتے تھے تو شمالی ہند اور خاص کر دہلی کے فارسی دانوں نے محسوس کیا کہ اب یہ زبان شاعرانہ خیالات کے اظہار کے لائق ضرور بن گئی ہے اور تب انہوں نے اس زبان کو شعر و ادب کے خزانوں

سے مالا مال کرنا شروع کر دیا۔"

ولی کا احسان اردو شاعری پر عمومی طور پر اردو غزل پر خاص طور پر یہ ہے کہ ولی نے شمالی ہند کے سنجیدہ اور اہم شاعروں کو اردو شاعری اور اردو غزل لکھنے پر مجبور کر دیا۔ پروفیسر نورالحسن ہاشمی نے لکھا ہے:

"دہلی میں باقاعدہ اردو شاعری کا آغاز تو ولی کے دیوان کے اثر سے محمد شاہ کے زمانے میں ۱۷۲۱ء سے شروع ہوتا ہے، لیکن اس سے بیشتر بھی اس کی داغ بیل پڑ چکی تھی، خود ولی ۱۷۱۲ء میں دہلی آئے تھے، اور اسی وقت ان کے کلام کی مقبولیت نے بہتوں کو اس طرف راغب کر لیا تھا، اسی عام رغبت کو دیکھ کر بعد میں حاتم، آبرو، فائز وغیرہ نے اردو میں شعر کہنا شروع کر دیا۔ ولی سے بیشتر دہلی میں کوئی سنجیدہ شاعر ادھر مائل نہیں دکھائی دیتا"

ولی اور تمام شمالی ہند کے اہم اور قابل اثر شاعر ولی ہی کو اپنا استاد اور رہنماء مانتے تھے۔ قائم چاند پوری، میر حسن، حاتم سبھی نے ولی کی استادی اور رہنمائی کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ "ریختہ" کو فروغ دینے میں ولی نے جو کام کیا ہے اس کا احساس ہندوستان سے ہزاروں کوس دور بیٹھے، گارساں دتاسی کو پوری طرح تھا، اس نے ولی کے اس سلسلے میں جو کام کیا ہے اس کے تعلق سے لکھا ہے:

"اس کے بعد پھر جنوب ہی میں اس بولی میں جسے دکھنی کہے ہیں ریختہ اشعار لکھے گئے، یہی طرز آ کر کار شمالی ہند کے شاعروں نے اپنی نظموں کے لئے اختیار کی، وہاں اس سے پہلے فارسی مستعمل تھی، دتاسی نے اس کے بعد دکنی کے کئی اور شاعروں کے نام گناتے ہوئے بتایا ہے کہ شمالی ہند میں اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز ہونے سے پہلے جنوبی ہند میں اعلیٰ درجے کی شاعری ہو رہی تھی، اور دکنی کے ایک شاعر نے شمالی ہند میں اردو شاعری کی شمع روشن کی۔ وہ لکھتا ہے:

"شمالی ہند کے شعرا نے کہیں اٹھارویں صدی عیسوی میں شہرت حاصل کی، حاتم جو ستر ہویں صدی کے آخر میں دہلی کا غالباً پہلا شاعر ہے، جس نے اردو میں لکھنا شروع کیا اور

اس کا اقرار کرتا ہے کہ اس نے عام زبان (اردو) میں لکھنے کا اس وقت فیصلہ کیا جب کہ ولی کا دیوان دہلی پہنچا اور پھر شمال کے دیگر شعرا نے اس کی تقلید کی"

بہر حال ولی کی استادی اور رہنمائی کو تمام شاعر اور اہل علم مانتے ہیں۔ آبرو نے نہ صرف کئی غزلیں ولی کی زمین میں کہی ہیں بلکہ میں اپنے اشعار میں بھی ولی کی استادی کا اعتراف کیا ہے:

ولی ریختے کی بیچ استاد ہے　　کہے آبرو کیونکہ اس کا جواب

خود ولی کو بھی اپنی بڑائی کا احساس تھا، وہ بڑے سے بڑے فارسی کے شاعر کے تعلق سے کہتے ہیں کہ وہ انہیں "حساب سخن" دیتے ہیں:

عرفی وانوری وخاقانی　　مجھ کو سب دیتے ہیں حساب سخن

ان کو یہ بھی احساس تھا کہ ان کی شہرت دور دور تک پھیل چکی ہے، کہتے ہیں:

ولی ایران وتوران میں مشہور ہے　اگرچہ شاعر ملک دکن ہے۔

پڑھتے ہیں ولی شعر ترا عرش پہ قدسی　　باہر ہے تری فکر رسا حد بشر سوں

ریختہ ولی کا جا کر اسے سناؤ　　رکھتا ہے فکر روشن جو انوری کے مانند

یو شعر ترا اے ولی مشہور ہے　آفاق میں　　مشہور ہے جیوں کہ سخن اس بلبل تبریز کا

ولی کا مقام اردو شاعری میں بے مثال ہے، انہوں نے جو اہم ترین کام اردو غزل میں کیا وہ یہ ہے کہ اس کو ایسی مستحکم بنیادیں فراہم کر دیں جس پر اردو غزل کی سر بلند عمارت کھڑی ہوئی ہے۔ میر حسن نے اپنے تذکرہ میں سب سے پہلے یہ بات کہی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"ولی کی تعریف احاطہ تحریر وتقریر سے باہر ہے، ریختہ کی بنیاد کو اس نے اس قدر مستحکم کر دیا ہے کہ اس کی بلندی آسمان سے بھی زیادہ ہوگئی ہے"

ولی کی غزل گوئی کو اردو کے تمام غزل گو شعراء پر فوقیت حاصل ہے کہ اس نے جہاں فارسی غزل

کے سارے انداز اور رنگ اپنا لئے وہیں اردو غزل کو ہندوستانی رنگ و آہنگ دیا۔ گارساں دتاسی وہ پہلا محقق اور نقاد ہے جس نے ولی کی اہمیت اور عظمت کو پہچانا اس نے آج سے تقریباً دوسو سال پہلے یعنی ۱۸۳۵ء میں ولی کے دیوان کے کئی قلمی نسخے حاصل کئے اور ولی کا دیوان مرتب کیا، اور فرانس کے شاہی مطبع سے شایع کیا اسی نے سب سے پہلے ولی کی شاعری کے ہندوستانی انداز اور اس کی انفرادیت کو پہچانا۔ وہ ولی کے کلام کا تعارف کرتے ہوئے دیوان ولی کے مقدمے کے آخر میں لکھتا ہے:

"اس تمہید کو ختم کرنے سے قبل ہندوستانی ادب کے ان شایقوں کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ چونکہ انہوں نے ابتک شمالی ہند کے مصنفین کی کتابیں پڑھی ہیں، اس واسطے ممکن ہے کہ ولی کے کلام کے دکنی اور ہندی الفاظ انہیں غیر مانوس معلوم ہوں، ولی کی زبان خاص ادبی نقطہ نظر سے شمالی ہند کی زبان سے زیادہ اہمتی رکھتی ہے"

ولی کی زبان میں جو وسعت اور تنوع تھا وہ اس لئے اہمیت رکھتا ہے اس کی وجہ سے اردو زبان ہر قسم کے مضامین ادا کرنے کی قدرت حاصل کر لیتی ہے۔ زبان میں جب لوچ و لچک ہوتی ہے اس میں اچھوتی اور نئی تشبہات اور استعارات اور علامات پیدا ہو سکتی ہیں۔ ولی کے تغزل میں جتنی اور جیسی لچک ملتی ہے وہ اردو کے کسی اور شاعر کے ہاں نہیں ملتی۔ ولی، فارسی اور عربی تلمیحات، استعارات، اور علامتوں کے ساتھ ہندوستانی الفاظ، تراکیب اور تلمیحات کو بھی خوب صورتی سے استعمال کرتے ہیں، ولی کے ہندوستانی انداز کے بارے میں ابوظفر عبدالواحد نے لکھا ہے:

"ولی کے مشرب حسن پرستی سے کہیں زیادہ اہم اس کا خالص ہندی تخئیل ہے۔ جس نے اس کے کلمات شعری میں ایک خاص دلکشی پیدا کر دی ہے۔ یہ خالص ہندی رنگ ولی کے بعد کے شعرا میں کہیں نہیں پایا جاتا"

اردو غزل میں فارسی روایات کے ساتھ ہندوستانی رنگ و آہنگ کی یہ شمولیت ولی کی غزل گوئی

کوایسی تاثیر عطا کرتی ہے جس کے اثر کو بعد کا کوئی غزل گو شاعر اپنائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسی وجہ سے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

"ولی نے قدیم روایت کے بہترین اور زندہ اثر کو اپنی شاعری میں سمیٹ لیا اور ان تمام آوازوں کو اپنی آواز میں جزب کر لیا جو تاریخ کے ساز کے مختلف تاروں سے نکل رہی تھیں۔ ولی دکنی کی شاعری میں سارے قدیم دور کی روح بھی بول رہی ہے۔ اور ساتھ ساتھ آنے والی نسل کو نئے امکانات سے متعارف بھی کرا رہی ہے۔"

ولی کے کلام میں قدیم اور گزشتہ آوازوں کے ساتھ آنے والوں کی صدائیں جس طرح گونج رہی ہیں۔ اس کا اندازہ ذیل میں دیئے گئے چند اشعار سے کیا جا سکتا ہے:

عشق کی راہ کے مسافر کو ہر قدم تجھ گلی میں منزل ہے

سفر عشق کا اگر ہے خیال ہمت دل کوں زاد راہ کرو

اے ولی طرز عشق آسان نہیں آزمایا ہوں میں کہ مشکل ہے

جسے عشق کا تیر کاری لگے اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے

شراب شوق سے سرشار ہیں ہم کبھی بے خود، کبھی ہشیار ہیں ہم

تو سر سے قدم تلک جھلک میں گویا ہے قصیدہ، انوری کا

لگتا ہے مجکو پنجۂ خرشید رعشہ وار دیکھا ہوں جب سے دست نگاریں نگار کا

تجھ مکھ کی پرستش میں گئی عمر مری ساری اے بت کی بچن ہاری اس بت کو بچاتی جا

عرفاں پہ ہمیشہ روشن ہے کہ فن عاشقی عجب فن ہے

ہر ایک سوں متواضع ہو سروری یہ ہے سنبھال کشتیٔ دل کو قلندری یہ ہے

زندگی جام عیش ہے لیکن فائدہ کیا اگر مدام نہیں

زاہد کو مثلِ دانہ تسبیح ایک آن　　کوچے ستی ریا سوں نکلنا محال ہے

شغل بہتر ہے عشق بازی کا　　کیا حقیقی و کیا مجازی کا

مفلسی سب بہار کھوتی ہے　　مرد کا اعتبار کھوتی ہے

پھر میری خبر لینے وہ میخار نہ آیا　　شاید کہ مرا حال اسے یاد نہ آیا

ایسا بسا ہے آ کر تیرا خیال جی میں　　مشکل ہے جی سے تجھ کو اب امتیاز کرنا

ولی اس گوہر کانِ حیا کی کیا کہوں خوبی　　مرے گھر میں اس طرح آتا ہے جیوں سینے میں راز آوے

اے ولی تجھ سخن کو وہ پہنچے　　جس کو حق نے دیا ہے فکر رسا

گرچہ پابندہ لفظ ہوں لیکن　　دل مرا عاشق معانی ہے

ولی شعر میرا سراسر ہے درد　　خط و خال کی بات ہے خال خال

تجھ جدائی میں نہیں اکیلا میں　　درد و غم اس باسی رہتا ہے

دشمن دیں کا دین دشمن ہے　　راہزن کا چراغ دشمن ہے

جسے عشق کا تیر کاری لگے　　اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے

موسیٰ جو آ کے دیکھے تجھ نور کا تماشا　　اس کو پہاڑ ہوئے پھر طور کا تماشا

اے ولی صاحب سخن کی زبان　　بزم معنی کی شمع روشن ہے

ڈاکٹر جمیل جالبی ولی کی شاعری میں جو موضوعات کا تنوع اور تجربات و مشاہدات کی فراوانی ملتی ہے۔ اس کے تعلق سے لکھتے ہیں:

"غرض کہ ولی کی شاعری میں اتنے پہلو، اتنے موضوعات، اتنے تجرباتِ زندگی سمٹ آتے ہیں کہ جس پہلو سے اردو غزل کو دیکھئے اس کی واضح ابتداء ولی سے ہوتی ہے۔ ولی کی غزل میں اردو غزل کی کم و بیش وہ ساری آوازیں سنائی دیتی ہیں جو سراج سے لے کر

داغؔ تک مختلف شاعروں کی انفرادیت کی نشانیاں ہیں اور جن سے آج تک "بزمِ معنی کی شمع روشن ہے" (تاریخ ادب اردو، صفحہ ۵۵۰)

ولؔی نے اردو غزل کے سارے امکانات کو روشن کر دیا اس لئے اسے بجا طور پر اردو غزل کا باوا آدم کہا جا سکتا ہے۔

سید محمد فراقؔ: (۱۸۷۵ء تا ۱۷۳۱ء) فراق، ولؔی کا ہم عصر تھا، ولؔی نے اپنے کلام میں اس کا ذکر کیا ہے، کہتا ہے:

ترے اشعار ایسے نیں فراقؔی جس پر رشک آوے گا ولی کوں

فراقؔ نے ایک مدت تک فارسی میں شاعری کی اور بعد میں اردو شاعری کی طرف متوجہ ہوا۔ غزلوں کے علاوہ اسکی ایک طویل مثنوی "مراۃ الحشر" ملتی ہے۔ جیسا کہ مثنوی کے نام سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ مثنوی قیامت کے واقعات اور علامتون کو تفصیل سے پیش کرتی ہے۔ مثنوی کے عنوانات نصرتی اور ہاشمی کی مثنویوں کی طرح ہیں، عنوانات شعر سے شروع ہوتے ہیں اور عنوانات کے اشعار کو اگر جمع کر کے پڑھا جائے تو مثنوی کا اجمالی تعارف ہو جاتا ہے، مثنوی میں قیامت کی ان علامتوں کو پیش کر کے نیکی کو اختیار کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس مثنوی کی اگر منعوعیت ہے تو یہ کہ اس میں فراقی نے اپنی زندگی کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ البتہ فراقؔی کی زبان بہت صاف ہے، غزل گوئی میں بھی اس کا مرتبہ بلند نہیں ہے۔

فقیر اللہ آزاد: ولؔی کے ہم عصر تھے، آزاد کا کلام بڑی مقدار میں نہیں ملتا، آزادؔ کا تذکرہ کئی تذکرہ نگاروں نے کیا ہے، میرؔ نے بھی اپنے تذکرے میں ان کی زبان کی صفائی کی تعریف کی ہے۔

داؤد اورنگ آبادی: مرزا داؤد بیگ داؤد، ولؔی کے بعد کے شاعر تھے، داؤد صاحبِ دیوان شاعر ہیں۔ ولؔی کو مانتے بھی اور ولؔی کے اندازِ سخن کی ممکنہ حد تک پیروی کرتے تھے۔ اور اپنے آپ کو فخریہ

طور پر "ولی ثانی" کہتے تھے:

علی کی ہے قسم سن شعر میرا کہے عالم ولی ثانی یہی ہے

کبھی اس بات پر فخر کرتے تھے کہ ان کے کلام پر ولی کا اثر ہے:

کہتے ہیں سب اہل سخن اس شعر کو سن کر تجھ طبع میں داؤد، ولی کا اثر آیا

داؤد نے نہ صرف ولی کی زمین میں بہت سی غزلیں کہی ہیں بلکہ ولی کے مصرعوں پر اچھی گرہیں بھی لگائی ہیں۔

ہوا معلوم مصرع سوں ولی کے پری رخساروں سے ملنا ہنر ہے

راست اے داؤد کہتا ہے ولی عشق میں صبر و رضا درکار ہے

پڑھونا صحیح انگے مصرع ولی کا نصیحت عاشقاں کوں کب روا ہے

داؤد کے کلام کی خصوصیت حسن پرستی ہے، وہ کود کہتے ہیں کہ میرے دیوان میں "وصف گل رو" کے سطر کچھ نہیں ہے:

کیا شاید پر بلبل سوں سطر ہر ورق اوپر کہ مجھ دیوان میں مضمون نہیں خبر وصف گل رو

ان کی شاعری میں "حسن یار کی تفسیر" ملتی ہے اور "گل بدن کے خیال" میں وہ "خوش بہار" ہو جاتے ہیں:

دیکھ داؤد ہے غزل تیری مصحفِ حسنِ یار کی تفسیر

گل بدن کے خیال میں داؤد مثلِ گلزار خوش بہار ہیں ہم

داؤد کی زبان بہت ہی صاف ہے جیسا کہ اوپر کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے، صفائی کے ساتھ روانی بھی ملتی ہے۔ داؤد اور سراج میں معاصرانہ چشمک رہا کرتی تھی، ذیل کے اشعار سے یہ چشمک پوری طرح ظاہر ہو رہی ہے:

جب سوں روشن ہے مجہ سخن کا شمع رشک سیتیں سراج جلتا ہے

داؤد گو سراجؔ پر چوٹیں کرتے ہیں لیکن سراجؔ کی برتری پر ایسی باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ داؤد ولیؔ کے بعد اپنے ہی کو شاعری کا صوبہ دار سمجھتے تھے، جیسا کہ انہوں نے اپنے دعویٰ کیا ہے:

حق نے بعد از ولیؔ مجھے داؤد　　صوبہ شاعری جمال کیا

داؤد کے اس دعوے کے تعلق سے ڈاکٹر جمیل جالبی نے بجا طور پر لکھا ہے:

"عدالتِ تاریخ کی دستاویز شاہد ہے کہ ولیؔ دکنی کے بعد صوبہ شاعری جس کی بحالی کا دعویٰ داؤد اورنگ آبادی نے کیا تھا، سراجؔ اورنگ آباد کے نام بحال ہو گیا، (تاریخ ادب اردو، ۵۶۶)

سراجؔ اورنگ آبادی: نام سید سراج الدین تھا، ولیؔ کے بعد اور میرؔ و سوداؔ سے پہلے کے بہت بڑے شاعر ہیں۔ سراجؔ کی مشہور و معروف غزل جس میں وہ "قبر تحیرِ عشق" کی بات کرتے ہین حقیقت میں ان کی شاعری کا بہترین اشاریہ ہے۔ وہ جنوں کی منزلوں سے بھی گزرے ہیں اور بے خودی، بے خبری کے عالم سے بھی۔ وہ خسرو کی بخیہ گیر، سے بھی آزاد ہے، انہوں نے زندگی بھر شاخ نہالِ غم کو ہرا ہی رکھا۔ بہر حال سراجؔ ان لوگوں میں سے تھے جو آتش عشق میں جل کر خاک ہو جاتے ہیں، سراجؔ بہت کم عمری میں فارغ التحصل ہو گئے تھے، سراج بوخیر تحیر عشق کی بات کرتے ہیں وہ شاعری نہیں حقیقت ہے۔ صرف بارہ سال کی عمر میں اس شدت سے عشق میں مبتلا ہو گئے کہ جنوں کی کیفیت طاری ہو گئی، اسی وجہ سے سراج کہتے ہیں:

زنجیر بھلی قید بھلی، موت بھی جیوں تیوں　　بن حق نہ کرے کس کوں گرفتار کسی کا

اس گرفتاریِ عشق میں حقیقی طور پر صحرا نوردی کی، دن رات گھومتے گھومتے شاہ برہان الدین غریب کی مزار پر پہنچے۔ اور وہاں اس جنون اور سرشاری میں فارسی میں اشعار بے اختیار و بے ساختہ نکلنے لگے۔ سراج نے خود لکھا ہے کہ اگر ان اشعار کو ضبط تحریر میں لایا جاتا تو ایک ضخیم دیوان مرتب ہو جاتا۔ وہ شاہ عبدالرحمٰن چشتی کے مرید ہو گئے۔ اس زمانے میں جب ان کی عمر صرف چوبیس سال

تھی ان کے پیر بھائی عبدالرسول خان نے ان کا دیوان مرتب کر دیا۔ سراج کا دیوان بہت ضخیم ہے اس میں غزلوں کے علاوہ مثنویاں، قصیدے، ترجیع بند مخمسات اور رباعیاں شامل ہیں۔ یہ دیوان ۱۷۳۹ء میں مرتب ہوا۔ جیسا کہ خود سراج نے بھی لکھا ہے کہ صرف ۲۴ سال کی عمر میں ان کا دیوان مرتب ہوا۔

جب کیا جزوِ پریشان سخن شیرازہ بند　　تھے برس چوبیس میری عمر بے بنیاد کے

سال ہجری تھے ہزار ایک صد و پنجاہ و دو　　واقفِ علمِ لانی صاحبِ ارشاد کے

سراج نے اپنا دیوان مرتب کر کے جب اپنے مرشد کی خدمت میں پیش کیا تو مرشد نے شاعری ترک کر دینے کا حکم دیا۔ سراج نے اسی وقت شاعری ترک کر دی۔ اور پھر اللہ سے ایسی لو لگائی کہ ان کا رشتہ اس زمانے میں برگزیدہ صوفیوں میں ہونے لگا۔ ۱۷۴۳ء میں ان کا انتقال ہوا۔ اس وقت ان کی عمر صرف اڑتالیس ۴۸ سال تھی۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے سراجؔ کے شاعری ترک کرنے کے تعلق سے لکھا ہے:

"سراجؔ کا شاعری ترک کرنا، جو ایک فطری شاعر کے لئے غیر فطری بات ہے اور ہمیں حیرت میں ضرور ڈالتا ہے لیکن ان کی شخصیت اور مزاج کے پیش نظر معلوم ہوتا ہے کہ عشق کی وہ آگ جو ان کے تخلیقی راستوں کو روشن کئے ہوئے تھی جیسے ہی بجھنی شروع ہوئی، شاعر کی شمع بھی اس کے ساتھ گل ہونے لگی۔ خود سراجؔ کو بھی اس بات کا احساس تھا۔ نہیں رہا سخن آبدار کا موتی سر جا طبع کے جوہروں کو رول چکا (تاریخ ادب اردو صفحہ ۵۷۸)

سراج کا ضخیم دیوان بھی اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ وہ "طبع" کے ہر جوہر کو رول چکے تھے۔ اور وہ محسوس کر رہے تھے کہ اب ان کے پاس "سخن" کا کوئی آب دار موتی باقی نہیں رہا ہے۔ گویا انہوں نے فطری تقاضے کی بنا پر شعر کہنا ترک کر دیا۔

سراجؔ کی شاعری کا غور و مرکز "عشق" ہے انہوں نے اپنی شاعری میں عشق کی مختلف کیفیتوں

اور حالاتوں کو اپنی شاعری میں بیان کیا ہے۔ وہ عشق کے جذبے میں اتنے سرشار اور ڈوب جاتے ہیں کہ کو دانہیں یہ خبر نہیں ہوتی کہ عشق کیا ہے، تیر عشق کی اسی کیفیت میں وہ کہتے ہیں

عشق کا نام گرچہ ہے مشہور　　میں تعجب میں ہوں کہ کیا شے ہے

اسی وجہ سے کسی اور شاعر نے کہا ہے کہ عشق کی منزل ہو یا کوئی اور منزل اس میں اتنا اور ایسا کھو جانا کہ خود منزل کا اسے ہوش نہ ہو جب سامنے منزل آجائے، منزل کی حقیقی معنوں میں یہی تلاش و جستجو ہے:

اتنا تو کم از کم کھو جاتے انسان تلاش منزل میں
منزل کا اسے کچھ ہوش نہ ہو جب سامنے منزل آجائے

ایسا صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو سب علوم میں "علمِ عشق" کو سب سے بہتر سمجھتا ہو:

سراج یوں مجھے استاد مہرباں نے کہا　　کہ علمِ عشق میں بہتر نہیں ہے اور علوم

عشق کی ایسی ہی کیفیات نے ڈوبنے والا ہی عشق کی مختلف کیفیات اس قدر فنکارانہ خوب صورتی اور چابک دستی سے بیان کر سکتا ہے:

خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی　　نہ تو تو رہا، نہ تو میں رہا، جو رہی سو بے خبری رہی
شہر بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی　　نہ خرد کی نجیہ گری رہی، نہ جنون کی پردہ داری رہی
کبھی سمتِ غیب سے کیا ہوا کہ چمن ظہور کا جل گیا　　مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہو سو ہری رہی
نظر تغافل یار کا گلہ کس زبان میں بیان کروں　　کہ شرابِ صد قوحِ آرزو خمِ دل میں تھی سو بھری رہی
وہ عجب گھڑی تھی میں جس گھڑی لیا درس نسخہء عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق میں جو دھری تھی تیو ہی دھری رہی
ترے جوشِ حیرت حسن کا اثر اس قدر سیں یہاں ہوا

کہ نہ آئینے میں رہی جلا، نہ پری کوں جلوہ گہ گری رہی
کیا خاک آتش عشق نے دل بے نوائے سراج کوں
نہ خطر رہا نہ حذر رہا مگر ایک بے خبری رہی

دلی جذبات و کیفیات کا اظہار اتنا اور ایسا ہو کہ سننے والے جذبے کی طاقت اور نزاکت کو فوراً سمجھ جائے، بہت مشکل کام ہے۔ اس کے لئے شاعر زبان کو تخلیقی بناتے ہیں۔ زبان تخلیقی اس وقت بنتی ہے جب نئی نئی تراکیب سے شاعر کام لیتا ہے۔ سراجؔ نے جو تراکیب استعمال کی ہیں وہ اس قدر قوت اظہار رکھتی ہیں کہ ان کی گونج میرؔ، غالبؔ، اور اقبالؔ جیسے عظیم شاعروں کے کلام میں سنائی دیتی ہے۔ سراجؔ نے جو تراکیب استعمال کی ہیں ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

تحیر "عشق" لباس برہنگی، خرد کی تنجیہ گری، جنوں کی پردہ دری، شامِ خیالِ غم، شراب صد قدح آرزو، زخمی تیغ انتظار، تشنہ ءزخم کف قاتل، کمنہ پیچ تاب زلف، سرمایہ دیدہ وجاں، روز دارانِ جدائی، سودائی بازار محبت، خیال عکسِ رخِ یار، لذتِ نعمت دیدار، سرمایہ آشفتہ دلی، محو خیال زلف کا کل، کمنہ حلقہ گیسو، خیال عارض گلرنگ، پیچ و تاب حلقہ زنجیر، جلوہ ءخورشید رو، باغبانِ گلشنِ خوش فکری، خیالِ نرگس عنبر سرشعت، بسمل خونین کفن، خیال قامتِ گل رو، زلف گرہ دار، موجِ خونِ دل، حیلہ ءکردم، بیمار شرح بے تابیِ دل، بیان شام جدائی، مشعلِ سوز جگر، اس طرح کی ترکیبیں اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہیں کہ سراج زبان کا خلاقانہ استعمال کرتے تھے۔

سراجؔ نے غزلوں کے علاوہ کوئی بارہ مثنویاں لکھی ہیں لیکن ان میں صرف ایک مثنوی "بوستانِ خیال" بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں بڑی روانی کے ساتھ سادگی ملتی ہے۔ جو بات اس مثنوی کو اہمیت بخشتی ہے وہ عشقیہ جذبات و کیفیات کا والہانہ اظہار ہے، یہ مثنوی اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس مثنوی کے ذریعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ سراج اب عشق مجازی کی طرف سے منہ موڑ کر عشق حقیقی کی

طرف رجوع ہو رہے ہیں، ان جہل و دستی، اور خواب غفلت سے بیدار ہو رہے ہیں، وہ خود کہتے ہیں:

گزر گئی مری بت پرستی میں عمر　　کٹی غفلت و جہل وستی میں عمر

میں اب چاہتا ہوں کہ ہوشیار ہوں　　اب اس خوابِ غفلت سے بیدار ہوں

انہوں نے یہ شاعری نہیں کی بلکہ حقیقی زندگی میں بھی انہوں نے جہل وستی کی زندگی یک لخت ترک کر کے وہ بیدار اور ہوشیار ہو گئے، اتنے اور ایسے کہ ان کا شمار اولیاء اللہ میں ہونے لگا۔ بہر حال سراجؔ نے زندگی میں جو کچھ کیا دل سے کیا۔ جب شاعری کی تو اتنی ڈوب کر کی کہ صرف چوبیس سال کی عمر تک ہی شاعری کی لیکن اردو کے صفِ اول کے شاعری میں ان کا شمار ہوتا ہے، ڈاکٹر جمیل جالبی ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

"سراجؔ قدر اول کے شاعر ہیں اور ان کے کلام میں اردو شاعری کے ایسے عناصر موجود ہیں کہ اس کے کچھ حصے نہ صرف ہمہ دلچسپی سے پڑھے جائیں گے بلکہ وہ اردو زبان کے کلچر کا جزو لائنفک بن گئے ہیں۔ سراج نے اردو شاعری کو ایک نیا معیار دیا اور عشقیہ شاعری کی روایت کو ولیؔ سے لے کر میرؔ تک پہنچا دیا۔" (تاریخ ادب اردو، ۵۸۲)

ولی اور سراجؔ کے بعد یوں تو کئی شاعروں کے نام ملتے ہیں جیسے شاہ قاسم علی قاسم، عارف الدین خان عاجزؔ، لچھمی نرائن شفیق وغیرہ، لیکن ولیؔ اور سراج کے درجے کا کوئی اور شاعر نہیں اور نہ ہی ملے گا۔

4.4 نمونہ امتحانی سوالات:

۱۔ ولیؔ کو اردو غزل کا باوآدم کیوں کہا جاتا ہے؟ بیان کیجئے؟

۲۔ دہلی میں اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز ولیؔ کی وجہ سے کیوں اور کس طرح ہوا؟ بیان کیجئے۔

۳۔ ولی کے بعد کے شاعروں کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ قلم بند کیجئے۔

۴۔ سراج کی زندگی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ تحریر کیجئے۔

۵۔ سراج اورنگ آبادی اردو شاعری میں کیوں اور کیا اہمیت رکھتے ہیں؟ بیان کیجئے۔

4.4 خلاصہ:

عادل شاہی اور قطب شاہی دور دکنی شاعری کا سنہری دور تھا، لیکن جن مغلیہ سلطنت نے دونوں حکومتوں کو ختم کر دیا تو سیاسی تبدیلیوں کے ساتھ لسانی تبدیلیاں بھی شروع ہوگئی اور طرز روز مردہ دکنی، محاورہ ءہند سے بدلنے لگی۔ دکنی کی جگہ ریختہ کو فروغ حاصل ہونے لگا۔ ولی نے دکنی اثرات کو قائم رکھتے ہوئے ریختہ میں غزل کا ایسا جادو جگایا کہ وہ "اردو غزل کے باوا" آدم بن گئے۔ کیونکہ اردو غزل کو مقبول و مشہور کرنے میں ولی نے وہ کام کیا جس کی مثال اردو شاعری کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ ولی پہلے خود دہلی گئے اور بعد میں ان کا دیوان دہلی پہنچا تو دہلی کے شاعروں کو احساس ہوا کہ دکنی زبان جس کو وہ لیچر اور پوچ سمجھتے تھے اس میں اعلیٰ درجے کی شاعری کی جاسکتی ہے۔ پروفیسر نورالحسن ہاشمی کہتے ہیں کہ دہلی میں اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز ولی کے دیوان کے اثر سے ہوا۔ اس بات کو سب سے پہلے مشہور مستشرق گارساں دتاسی نے لکھا ہے کہ شمالی ہند کے شاعروں نے ولی ہی کی وجہ سے اردو میں شاعری شروع کی۔ ورنہ ولی سے پہلے شعر و ادب ہو کہ علم و فن، فارسی ہی میں کام ہوتا تھا، حاتم نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اس نے ولی کا دیوان دیکھنے کے بعد اردو میں شاعری کی ہے اور وہ اردو کا پہلا شاعر ہے۔ اس کے بعد دوسرے شمالی ہند کے شعراء نے اس کی تقلید کی۔

ولی کی اہمیت اور عظمت کو شمالی ہند کے تمام شاعر مانتے ہیں، میر حسن جیسا شاعر بھی اپنے تذکرہ میں لکھتا ہے کہ "ولی کی تعریف احاطہ ءتحریر و تقریر سے باہر ہے۔ قائم چاندپوری نے لکھا ہے کہ

ولی کے دیوان کی ہر سمت مطلع آفتاب سے زیادہ روشن ہے، کاشف الحقائق کے مصنف امداد امام اثر کا کہنا ہے کہ ولی کے بعد کے جتنے بھی شاعر ہیں، درحقیقت اسی پیر طریقت کے مرید ہیں۔ ولی کی غزل گوئی تمام اردو غزل گو شعراء پر اس لئے فوقیت رکھتی ہے کہ اس میں قدیم دور کی روح بھی بول رہی ہے۔ اور آنے والی نسلوں کو نئے احکامات سے متعارف کر رہی ہے۔ اردو غزل کے وہ سارے رنگ جو آج اردو شاعری میں ملتے ہیں ان کا سلسلہ ولؔی سے جا کر ملتا ہے۔

ولؔی کے ہم عصر شاعروں میں سید محمد فراقی بھی ہیں، فراقی مدت تک فارسی ہی میں شعر کہتے تھے، بعد میں اردو شعری کی طرف متوجہ ہوئے ان کی غزل گوئی ولی کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی ۔ انہوں نے ایک مثنوی "مراۃ الحشر" کے نام سے لکھی ہے۔ جس میں قیامت کلی علامتوں کو پیش کر کے نیکی کی تلقین کی گئی ہے۔ اس مثنوی میں فراقؔی نے اپنی زندگی کے حالت تفسیل سے بیان کئے ہیں، البتہ زبان میں صفائی اور روانی ہے۔

ولؔی کے ایک اور ہم عصر فقیر اللہ آزاد تھے، میر نے اپنے تذکرے میں ان کی زبان کی تعریف کی ہے۔ ولؔی کے بعد کے شعرا میں مرزا داؤد بیگ داؤؔد، ارنگ آبادی، صاحب دیوان شاعر ہیں، ولی کے بے حد معتقد اور مقلد تھے، انہوں نے ولی کی زمین مین بہت سی غزلیں کہی ہیں۔ اس بات پر فخر کرتے تھے، کہ ان کے کلام پر ولؔی کا اثر ہے۔ کبھی اپنے آپ کو "ولی ثانی" کہتے تھے، ان کے کلام میں زبان کی روانی اور صفائی ملتی ہے۔ سراؔج سے معاصرانہ چشمک تھی، لیکن سراج ولی کے بعد صرف سراج ہی دکن کے اہم ترین شاعر تھے۔

سراؔج کا نام سید سراج الدین تھا۔ ان کی پوری زندگی عشق ومحبّ سے عبادت ہے، کواہ وہ عشق مجازی ہو یا عشق حقیقی۔ ان کا عشق جنون کی حد تک پہنچ گیا۔ انہوں نے خود لکھا ہے کہ جنون کی حالت میں فارسی میں جو انہوں نے کہا تھا اگر ان کو قلم بند کر لیا جاتا تو ایک دیوان تیار ہو جاتا۔ وہ شاہ

عبدالرحمٰن چشتی کے مرید ہو گئے۔ انہوں نے چوبیس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے اتنے اشعار کہے تھے کہ ایک ضخیم دیوان تیار ہو گیا تھا، ان کے پیر بھائی عبدالرسول خان نے ان کا دیوان مرتب کر کے جب ان دونوں نے اپنے پیر و مرشد کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے سراجؔ کو حکم دیا کہ وہ شعر گوئی ترک کر دیں۔ سراج نے اس کے بعد شعر کہنا ترک کر دیا۔ سراجؔ کے اس دیوان میں غزلوں کے علاوہ بارہ مثنویاں ہیں، قصیدے، ترجیع بند، لحمسات اور رباعیاں شامل ہیں۔ یہ ضخیم دیوان صرف چوبیس سالہ شاعر کا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ سراج کتنے پر گو شاعر تھے، زود گوئی کے باوجود وہ اعلیٰ درجے کے شاعر تھے۔

سراجؔ کی شاعری کا غور و مرکز عشق ہے۔ عشق کی مختلف کیفیات کو انہوں نے جس قدر کوب صورتی اور موثر انداز میں پیش کیا ہے، وہ انہیں کا حصہ ہے۔ سراج ان شاعروں میں سے ہیں جو آنے والی نسلوں کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ سراجؔ نے جو زبان استعمال کی ہے، جو تراکیب وضع کی ہیں وہ خود ان کی شاعری کے لئے وجہ افتخار نہیں ہیں بلکہ آنے والے شاعروں کے لئے انہوں نے اتنے اور ایسے نمونے چھوڑے ہیں جن کو اپنا کر آنے والے شاعروں نے اپنی تربیت پائی ہیں۔ ولیؔ اور سراج اردو شاعری کے ہند ساز شاعر ہیں۔

سراج کے بعد اور بھی کئی نام دکنی شعرا کے ملتے ہیں جن میں شاہ قاسم علی قاسمؔ، عارف الدین خان عاجز اور لچھمی نرائن شفیق کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں، لیکن ان میں کوئی بھی عہد ساز شاعر نہ تھا۔

4.5 فرہنگ:

لفظ	معنی	لفظ	معنی
سراج	فرہنگ	شماتت	کسی کے بگڑنے پر خوش ہونا

تسخیر	فتح کرنا	سایہ فگن	سایہ ڈالنا
وثوق	یقین	سالک	راستہ چلنے والا،
قدوۃ السالکین	سالکین کا پیشوا		اللہ کے راستے پر چلنے والا
زبدۃ العارفین	عارفین کا ممتاز	تامّہ	کامل، مکمل

ملہمات مہم کی جمع، غیب سے دل میں ڈالی ہوئی بات، الہام

زادرہ توشہ جو راستے میں کام آئے

حشر	قیامت، انجام،	سراۃ	آئینہ
اجمال	اختصار		

4.6 سفارشی کتب

۱۔ ولی کا دبستان شاعری	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی
۲۔ تاریخ ادب اردو جلد اول	ڈاکٹر جمیل جالبی
۳۔ آب حیات	محمد حسین آزاد
۴۔ کاشف الحقائق	امداد امام اثر
۵۔ گارساں دتاسی	ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ

Notes

Notes

Notes

ಆದೇಶ ಸಂಖ್ಯೆ : ಕರಾಮುವಿ/ಅಸಾವಿ/2–1615/2012–2013 ದಿನಾಂಕ : 24.07.2012
ಒಳಪುಟ : 60 GSM ವೆಸ್ಟ್‌ಕೋಸ್ಟ್ ಪೇಪರ್ ಮತ್ತು ಹೊರಪುಟ : 170 GSM ಆರ್ಟ್‌ಕಾರ್ಡ್
ಮುದ್ರಕರು : ಗೀತಾಂಜಲಿ ಗ್ರಾಫಿಕ್ಸ್, ಬೆಂಗಳೂರು. ಪ್ರತಿಗಳು : 200

Karnataka State Open University

Manasagangotri Mysore - 570 006

The Open University system has been initiated in order to augment opportunities for higher education and as an instrument of democratizing education.

National Education Policy 1986

REGIONAL CENTRES

Bangalore
Davanagere
Gulbarga
Dharwad
Shimoga
Mangalore
Tumkur
Hassan
Chamarajanagar
Bellary
Mandya
Kolar
Bijapur
Belagaum
Ramanagar
Bangalore (another one)
Chikmagalur
Udupi
Karwar
Bidar
Mysore

HEAD QUARTERS

Total Study Centres : 123

Regional Centres : 21

B.Ed Study Centres : 10

M.Ed Study Centres : 06

KSOU

Higher Education to everyone everywhere
ಉನ್ನತ ಶಿಕ್ಷಣ ಎಲ್ಲರಿಗೂ ಎಲ್ಲೆಡೆ

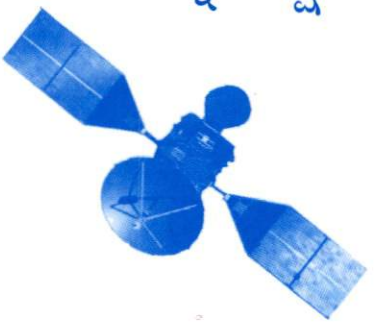

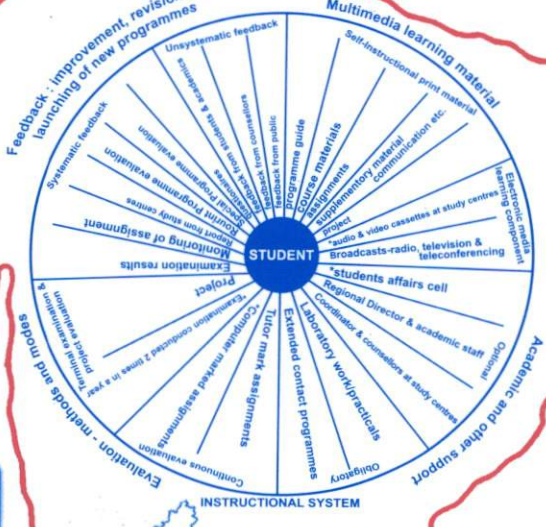

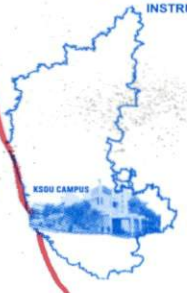

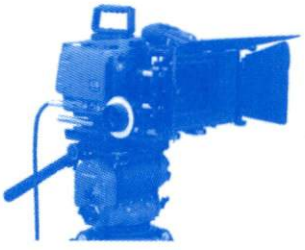

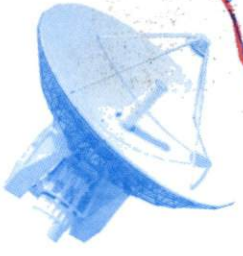

ಕರ್ನಾಟಕ ರಾಜ್ಯ ಮುಕ್ತ ವಿಶ್ವವಿದ್ಯಾನಿಲಯ
ಮಾನಸಗಂಗೋತ್ರಿ, ಮೈಸೂರು – 570 006

Karnataka State Open University
Manasagangotri, Mysore - 570 006 Website : www.ksoumysore.edu.in